مسائل و قصص

قرآن مجید سے متعلق دو فاضلانہ و محققانہ مقالات کا مجموعہ

بعد نظر ثانی اضافہ و ترمیم

2619-

از

مولانا عبد الماجد دریابادی

ادارۂ اشاعت اردو

حیدر آباد (دکن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

قرآن مجید کی تحریری خدمت کا شغل تو عرصہ سے جاری ہے۔ پچھلے دنوں دو علمی مجلسوں میں کارکنوں کی دعوت پر مقالہ سنانے کا بھی اتفاق ہوا۔

پہلے مقالہ کا عنوان ہے " بعض قدیم مسائل جدید روشنی میں" یہ رضا اکاڈمی (رامپور) کے جلسہ میں ۲۰ دسمبر ۱۹۴۱ء کی شام کو سنایا گیا۔ اکاڈمی مذکور کوئی دینی و مذہبی ادارہ نہیں ایک علمی مجلس ہے۔ اس کے اندر گفتگو قرآن مجید کے صرف علمی اثری، جغرافی، تاریخی پہلوؤں ہی پر ممکن تھی۔ آج وہ مقالہ بہت سے اضافوں اور ترمیمات کے بعد رسالہ کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

دوسرے مقالہ کا عنوان ہے " جدید قصص الانبیاء" یہ اسلامیہ کالج پشاور کی مجلس اسلامیات کے جلسۂ خصوصی

فہرس

ناظرین سے!

ادارۂ اشاعت اردو آج حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ کی یہ چوتھی کتاب ہدیۂ ناظرین کر رہا ہے۔ اس سے پہلے مولانا کے افادات میں سے، مضامین عبدالماجد، محمد علی کی ڈائری، اور مردوں کی مسیحائی پیش کی جا چکی ہیں، مولانا کا سحر طراز قلم اور مولانا کی علمی وتحقیقی کاوشیں، دونوں اس سے بہ ہزار گونہ بلند ہیں کہ ان کے متعلق تعارفی انداز میں کچھ کہا جائے، کون نہیں جانتا کہ مولانا ایک دلفریب اور مخصوص طرز نگارش کے مالک ہیں جس کی کامیاب نقالی کرنے والا بھی اب تک کوئی دوسرا پیدا نہ ہوسکا ہے، چہ جائیکہ مدمقابل، اور کسے نہیں معلوم کہ علوم قدیم وجدید کے سرچشموں سے مولانا نے جس وفور اور آسودگی کے ساتھ سیرابی حاصل کی ہے وہ بہتوں کے لئے ممکن نہ ہوسکی چہ جائے کہ اس کے بعد کے پیدا ہونے والے افکار عالیہ، اور نظر بصیرت۔

کتاب کیا ہے، ناشر کیا بتا سکتا ہے، خود مصنف نے دیباچہ میں وضاحت کے ساتھ بتادیا ہے، ناشر کو صرف اس قدر کہنا ہے کہ ادارہ نے فرضی ومثالی

میں ۱۸،۱۹ جنوری ۱۹۴۲ء کی صبح کو سنایا گیا۔ اور آج خفیف سی تصحیح و ترمیم کے بعد تقریباً بعینہٖ شایع ہو رہا ہے۔

دونوں مقالے قسط وار صدق (لکھنو) میں نکل چکے ہیں۔ اِن کے مجموعہ کا نام مسَائل و قِصص تجویز ہوا ہے۔ اور یہ پہلا ایڈیشن اِدارۂ اِشاعت اُردو حیدرآباد دکن کو دیا جا رہا ہے۔

دونوں مقالے بعض مخلصین کے صدق طلب ہی کا ثمرہ ہیں۔ پہلا مقالہ، اکاڈمی کے خوش ذوق صدر مولوی معین الدین صاحب لکھنوی بی۔ اے بیرسٹرایٹ لا (جج ہائیکورٹ رامپور) اور خادم علم سکرٹیری مولوی اِمتیاز علی صاحب عرشی (مہتمم کتاب خانہ ریاست) کی تحریک پر تیار ہوا تھا اور دوسرا مجلس اِسلامیات کے پُرجوش صدر مولانا نورالحق صاحب ندوی (ناظم دینیات کالج) اور ہونہار سکرٹیری محمد اسحق صاحب کی دعوت پر۔

احباب کی محبت کا شکریہ ضروری ہے۔

خداوندکریم اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے اور رسالہ کو دینی اور علمی دونوں حیثیتوں سے نافع بنائے۔

دریاباد ضلع بارہ بنکی　　　　عبدالماجد

قدیم مسائل

جدید روشنی میں

قرآن مجید اور علوم حاضرہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ دنیا کی ایک اہم ترین علمی کتاب بھی۔ مطالعے کے قابل مسلم کے بھی، غیر مسلم کے بھی۔ ان تیس ۳۰ پاروں کی ضخامت کے اندر، اللہ اکبر، کیا کچھ بھرا ہوا ہے! توحید و رسالت کے عقیدے ہیں، روح و جزائے عمل کے مسئلے ہیں۔ فقہ و قانون کی دفعات ہیں، معاشرت و اخلاق کی تعلیمات ہیں۔ سیاسیات کے ضابطے ہیں، معاشیات کے قاعدے ہیں اگلوں کی حکایتیں ہیں، پچھلوں کے لئے ہدایتیں ہیں۔ اشخاص کے تذکرے ہیں، اعمال پر تبصرے ہیں —— ایک بے علم و ہیچمدان خدمتِ قرآن میں اپنی بساط کے لایق کئی سال سے لگا لپٹا ہوا، جب ایسی

افسانے شائع کئے ہیں۔ موجودہ انسانوں کی نفسیاتی کیفیتوں کا حال متعدد مصنفین کے زورِ قلم نے سنایا ہے، آج سچے افسانوں کا مجموعہ بھی شایع کر رہا ہے، ایسے سچے افسانے جن کی سچائی پر بڑے بڑے مدعیان علم کا اعتراف جہل شاہد، اور آسمان و زمین کا ایک ایک ذرہ گواہ ہے؛

نو آسنجی اور گرم نوائی کے بہتیرے نمونے آپ نے دیکھے ہوں گے، اور بہتر سے بہتر نمونے خود ادارۂ اشاعت اردو نے پیش کئے ہیں۔ لیکن اس کتاب سے جو سکون اور جو بصیرت آپ کو حاصل ہوگی وہ دوسری جگہ سے آپ کو کبھی نہیں مل سکتی۔ ادبی کتابوں سے جو گرمی قلب و دماغ میں پیدا ہوتی ہے وہ حرارت باطل ہے اور اس کتاب سے جو بیک وقت علم بھی ہے اور ادب بھی، نصیحت بھی ہے اور عبرت بھی، تاریخ بھی ہے اور انشاء بھی اور ان سب سے زیادہ سچ ہے اور خوش گوار سچ، حق و صداقت ہے اور مرغوب و مطلوب، دل و دماغ میں ایک کیفیت پیدا ہوگی جس میں ایمان و یقین کی حرارت اور علم و بصیرت کی سکینت کا لطیف امتزاج ہوگا۔

(چوہدری) محمد اقبال سلیم کاہندری

۲۴ مارچ ۱۹۴۴ء

نام اس قوم کا بنی اسرائیل ——— تاریخ دانی نے کان کھڑے کیے طبیعت کے کھوج نے سوال کیا کہ دعویٰ پر دلیل؟ ذوق تجسّس نے بیدار ہو کر پوچھا کہ بیان کا کوئی ثبوت؟

آثارِ قدیمہ کے راوی کا بیان ہے کہ اسرائیل لقب ہے یعقوب بن اسحٰق کا۔ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہوئے ہیں۔ اسلامی عقیدہ میں بھی مسیحی عقیدہ میں بھی، اور یہودی عقیدہ میں بھی۔ نام عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ لغوی معنیٰ ہیں خدا کے بندے یا خدا کے پہلوان کے۔ پوتے تھے حضرت ابراہیم پیغمبر کے۔ سالِ پیدائش سنہ ۲ ق۔م ہے۔ یعنی آج سے ۱۴۹ سال قبل۔ وطن فلسطین، یا قدیم بولی میں کنعان اُس وقت ملک شام کا ایک سرسبز صوبہ تھا۔ دو بیاہتا بیویاں تھیں اور دو شرعی باندیاں۔ ان چار سے اولاد کل ملا کر بارہ بیٹے ہوئے۔ اِن سے جو عظیم الشان نسل چلی وہ تیزی کے ساتھ پھیلی اور بڑھی۔ اسی کا نام بنی اسرائیل پڑا۔ دنیا کے اُتار چڑھاؤ جس طرح سب دیکھتے ہیں، اُنھوں نے بھی اپنی تاریخ میں دیکھے۔ کبھی گرے، کبھی اُبھرے۔ آج جیتے، کل ہارے۔ ابھی حکومت کی، ابھی حکومت سہی۔ اِس حیثیت سے ان کی تاریخ ویسی ہی ہے۔ جیسی دنیا کی اور ساری قوموں کی۔ اور اِس معنیٰ میں اُنھیں کوئی خاص اَفضلیت کسی دوسری قوم پر نہیں۔ لیکن عروج و زوال کے سارے چکروں

آیتوں پر پہنچا جن کا تعلق نظر آیا۔ اسی دنیا کے گزرے ہوئے واقعات سے، اسی کائنات کے اشخاص و مقامات سے، تو طبیعت میں کرید قدرۃً یہ پیدا ہوئی، کہ یہ تذکرہ کب کا ہے؟ کہاں کا ہے؟ یہ شخص کون ہے؟ یہ قوم کون سی ہوئی ہے؟ یہ واقعہ جو پیش آیا، کس کیفیت کے ساتھ پیش آیا؟ تاریخ اپنی روشنی کی کوئی کرن ان واقعات پر ڈالتی ہے؟ جغرافیہ کوئی پتہ نشان اِن مقامات کا اپنے نقشہ پر بتاتی ہے؟ —— سوالات کے جوابات جو ملے، اُن کا ایک مختصر سا حصّہ اس مجلس علمی کے روبرو پیش ہو رہا ہے۔ مقالہ کسی محقق کا اپنے ہمسروں اور ہمعصروں کے سامنے نہیں، آموختہ ایک ادنیٰ طالب علم کا ہے اہل علم کے سامنے، وہ بھی کچھ کچا کچا سا۔

بنی اسرائیل کی کائناتی اہمیت

قرآن کا خطاب دنیا کی ساری قوموں سے ہے لیکن ذکر ایک خاص قوم کا، اور ذکر بھی اُس پر الطافِ خداوندی کی بارش کا، اس تفصیل اور اس تکرار کے ساتھ آتا ہے کہ گویا وہ قوم جوہر ہے، دوسری قومیں عرض۔ وہ ایک اصل ہے اور باقی سب شاخیں۔ وہ ایک مقصود ہے اور دوسری قومیں طفیلی۔

یہاں تک کہ اس قوم کو مخاطب کرکے صاف صاف ارشاد ہو گیا ہے کہ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ہم نے تمھیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دے رکھی تھی

جان سے، مکان سے، ممکن ہی اُس کے لیئے یہ کیونکر ہے کہ وہ اپنے کو قالبوں میں منتقل کرتا رہے! ——— یہی راز ہے اس کا کہ یہی ایک قوم بہ حیثیت قوم بچی رہی عقیدۂ توحید پر، اور بچی رہی مظاہر پرستی سے، عناصر پرستی سے، صنم پرستی سے، حجر پرستی سے، بخلاف مصر و کلدانیہ، ایران و ہندوستان اور آخر میں یونان کے، اِن سب کے درمیان، اُنھیں سے گھری ہوئی، لیکن اِن سب سے الگ تھلگ، یہی ایک قوم ایسی رہی، جو کلمہ پڑھتی رہی خالق کی تنزیہ و تقدیس کا، اس حال میں کہ ہمعصر قومیں تشبیہ و تجسیم کی بھول بھلیاں میں اپنے کو گم کرتی گئیں توحید کا جھنڈا اسی کے ہاتھ میں بلند رہا۔ تنزیہ اور توحید کا ہے بھی چولی دامن کا ساتھ!

بس یہی خصوصیت نسل اِسرائیل کی وہ ہے جس نے اُسے شرف و اِمتیاز دے رکھا ہے تمام دوسری نسلوں پر، نسل اِنسانی کے سارے دوسرے کنبوں، خاندانوں پر۔ قرآن نے اُسی کو تعبیر کیا ہے اقوامِ عالم پر افضلیت سے۔ قرآنی معیارِ افضلیت اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ فلسفہ و حکمت، شعر و اُدب، صنعت و حرفت مال و دولت، حکومت و تجارت کے سکّے اور جہاں کہیں بھی رواں ہوں قرآن کا معیار بزرگی تو یہی توحید کی دولت ہے اور ایمان باللہ کی نعمت۔ کیا مضائقہ اگر اس قوم کی تاریخ کے صفحات خالی ہیں ارجن اور بھیم کے

کے باوجود ایک چیز اُن کی ہمیشہ قایم رہی۔ نبوت کی شمع جو اُن کے خاندان میں ایک بار جل چکی تھی، بجھی نہیں برابر روشن رہی۔ نبی اُن کے ہاں مُسلسل پیدا ہوتے رہے۔ افراد انبیاء کے مقابلہ میں عداوتیں، بغاوتیں، انھوں نے برابر برتیں، آج اس نبی کو جان سے مار ڈالا، کل اُس نبی کو وطن سے نکال دیا۔ لیکن نفس نبوت کے قائل برابر بنے رہے۔ عمل میں باغی، طاغی، غدار کیسے ہی ثابت ہوئے ہوں، لیکن عقیدہ میں مسئلہ نبوت کے منکر نہ ہوئے۔

اُفضلیت کا معیار معاصر قومیں، ترقی کرنے والی قومیں، دولت و حکومت والی قومیں، پڑھی لکھی قومیں مصر میں اور ہندوستان میں بھی، عراق میں بھی تھیں اور ایران میں بھی۔ ان کے کان رسول کے پیام اور نبی کے کلام سے ناآشنا رہے۔ اُن کے ہاں "اوتار" آتے رہے۔ یعنی بھگوان خود کسی نہ کسی قالب میں ظاہر ہوتا رہا۔ کسی مخلوق کے جسم کے اندر حلول کرتا رہا۔ اِس ساری مدت میں یہی ایک قوم اسرائیل ایسی رہی، جس میں نبی پر نبی، اور رسول پہ رسول آتے رہے۔ محض پیام بر تھے۔ کسی بالا و برتر کا پیام لاتے رہے، کسی قوی و قادر کا کلام سُناتے رہے ——— جو خود بلند تر ہو زمین کی ساری وسعتوں سے، آسمان کی ساری رفعتوں سے۔ منزّہ ہو جسم سے

گروہ ہے اطاعت شعاروں کا، وفاداروں کا، ایمان والوں کا۔ دوسرا ہے باغیوں کا، طاغیوں کا، منکروں کا۔ دوسرے رکوع کا مضمون یہ ہے کہ نوعِ انسان کا ایک تیسرا گروہ بھی ہے۔ زبان سے وفادار، اور دل کے غدّار۔ ہیں یہ لوگ بالکل باغی اور منکر۔ لیکن دھوکا دینے کے لیئے وردی وفاداروں کی پہن لی ہے۔ گویا حق کے قبول و رد کے معیار سے کوئی تیسری تقسیم ممکن ہی نہیں۔ قسمیں کُل وہی دو ہیں۔ اَب تیسرے رکوع میں قرآن اپنی اصل دعوت، یعنی پیامِ توحید و رسالت کو پیش کرتا ہے۔ اور مخاطب سارے عالمِ اِنسانی کو بہ حیثیت مجموعی کرتا ہے۔ چوتھے رکوع میں بیان ہے انسانیت کی تاریخ کا۔ یعنی اِنسان کو پیدا کیا گیا اس خاص طریقہ پر، اس خاص مقصد کے لیئے۔ اب آگے قرآن کو یہ مضمون لانا ہے کہ نسلِ اِنسانی میں سے ایک خاص خاندان اس دعوت کے لیئے چُن لیا گیا۔ دنیا میں اس پیام کی منادی اُسی مخصوص قوم کے ذریعہ سے کی گئی۔ قرن پر قرن، اور صدیوں پر صدیاں گزرتی گئیں، اور وہ مخصوص قوم اپنی مسلسل نافرمانیوں سے، اپنی پیہم عہد شکنیوں سے اپنے کو اِس نعمت کا نااہل ہی ثابت کرتی گئی، موقع پر موقع ملتے رہے، اور ہر نئی مہلت مزید سرکشی ہی پر ختم ہوتی رہی اِس لیئے اب نظامِ نو میں وہ نعمت، اُس مخصوص نسل سے چھین کر، ایک دوسری نسل کے پیامبر کے واسطہ سے، ساری دنیا کے لیئے بلا اِمتیاز

ترانوں سے، ارسطو اور فلاطون کے افسانوں سے ہومر اور کالیداس کی کی بساطِ بزم سے، دارا اور سکندر کے میدان رزم سے۔ قرآن کی نظر میں تو قدر موسیٰؑ و ہارونؑ، داؤد و سلیمانؑ، الیاسؑ و زکریاؑ، یحییٰ و عیسیٰؑ کی ہے۔

قوم و اُمّت کا فرق

ابھی گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل نام ہے ایک خاص خاندان کا۔ حافظہ میں پھر ایک بار اِس حقیقت کو تازہ کر لیجئے کہ بنی اسرائیل نام کسی مذہب و دین کا نہیں، کسی عقیدہ و آئین کا نہیں۔ نام ہے ایک مخصوص نسل کا۔ اِس لیئے اُمت محمدی اور قوم اسرائیل کے درمیان تقابل و تفاضل کا کوئی سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اور قرآن کے جن طلبہ نے اِن بحثوں کو چھیڑ دیا ہے، وہ بیچارے خلط کر گئے نسل اور دین کے درمیان۔ اور نظر انداز ہو گئی اُن کے ذہن سے یہ حقیقت کہ اُمتِ محمدی کے فضائل جو کچھ ہیں، وہ افراد کے اِختیار کیئے ہوئے دین، عقیدہ، مسلک کے اِعتبار سے ہیں، نہ کہ اُفراد کی غیر اِختیاری نسلیت و قومیت کی بنا پر!

اَب ایک نظر اس پر بھی کر لیجئے، کہ قرآن میں ذکر بنی اسرائیل کا شروع کس موقع پر ہوتا ہے۔ پارۂ اوّل کے سب سے پہلے رکوع میں مذکور یہ ہے کہ اِنسانیت کی تقسیم خدا کے ہاں صرف دو گروہوں میں ہے۔ ایک

لفظ بیکار لاتا ہی نہیں۔ پھر یہ کیا ہے؟ ہے یہ کہ ان دونوں لفظوں کے مفہوم بالکل الگ الگ ہیں۔ بنی اسرائیل نام ہے ایک مخصوص نسل کا۔ ایک متعین قبیلہ کا۔ اس کی ایک تاریخ ہے۔ اس کا ایک ماضی رہ چکا ہے۔ یہود اس کے برعکس۔ نام ہے ایک مذہبی فرقہ کا، ایک دینی اُمّت کا۔ اس کے کچھ مخصوص عقاید ہیں، اس کا ایک مخصوص مسلک ہے۔ اب سیاق کلام جہاں جہاں تاریخی ہے، قومی ہے، مقصود اُن کے نسلی کارناموں کو یاد دلا دلا کر اُنھیں شرم دلانا، اُن پر حجت قایم کرنا ہے، عرب نسل اور بنی اسمٰعیل کے ساتھ اُن کے حسد و تعصب کا ذکر کرنا ہے، ایسے کل موقعوں پر نام بنی اسرائیل کا آیا ہے۔ بہ خلاف اس کے سیاق جہاں جہاں مذہبی ہے، مقصود اُن کے باطل عقاید کی پردہ دری ہے۔ اشتراک اُن کا نصاریٰ کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ تقابل اُن کا مشرکین سے، مومنین سے، غرض کسی مذہبی فرقہ کے ساتھ کیا گیا ہے، ایسے ہر موقع پر نام یہود کا لیا گیا ہے! ——— شروع سے آخر تک قرآن کی آیتوں کا استقصا کر جائیے، ہر جگہ یہی التزام نظر آئے گا!

اَلَّذِیْنَ هَادُوْا کی تفسیر اور سنیئے۔ سارے قرآن میں کہیں کہیں یعنی کوئی آٹھ دس جگہ بجائے اسم الیھودَ کے ایک فقرہ اَلَّذِیْنَ هَادُوْا آیا ہے، یعنی وہ لوگ

نسل و قوم، عام کی جا رہی ہے۔ اب ایک عالمگیر ہادی ساری دُنیا کے لیۓ
بھیجا جا رہا ہے۔ یہ وہ پیامبر ہے جس کے بعد کوئی پیام نہ آئے گا۔ آیندہ
اعتبار صرف افراد کے عقاید و اعمال اِختیاری کا کیا جائے گا۔ کوئی اسرائیلی
ہو، اسمٰعیلی ہو، آریائی ہو، تاتاری ہو غرض کسی نسل کا بھی ہو، جو بھی صحیح راہ
اِختیار کر لے گا، بس نجات اسی کی ہے۔ اس سارے مفہوم کے شروع
کر دینے کے لیۓ بہترین جگہ کون سی ہو سکتی تھی؟ یقیناً وہی جہاں خلقتِ اِنسانی
اور مقصد آفرینش کا بیان ختم ہوا ہے —— یہیں سے یہ ہے کہ
خلقتِ اِنسانی اور مقصد آفرینش کے معاً بعد اِدھر چوتھا رکوع ختم ہوا،
اُدھر پانچویں رکوع کے ساتھ اس مخصوص اِنعام یافتہ نسل بنی اسرائیل کا
ذکر شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر بہت دور تک سلسلہ اُن کی شرارت و سرکشی
کا چلا جاتا ہے —— ترتیب مقتضائے حال کے عین مطابق بیان حسن
بیان کے ہر تقاضہ کو پورا کرنے والا۔

ایک نازک نکتہ آگے چل کر قرآن میں ذکر یہود کا آتا ہے، اور بار بار آتا ہے۔ اور بنی اسرائیل کا تذکرہ بھی موقوف
نہیں ہوا ہے، وہ بھی برابر آئے جاتا ہے۔ تو کیا ایک مفہوم کے لئے
قرآن دو لفظ ادل بدل کر لا رہا ہے؟ کبھی یہ نام لے دیا، کبھی وہ؟
لیکن ایسے بلیغ اور پُر حکمت کلام سے یہ ہے بہت بعید۔ قرآن تو کوئی

بول چال، کھانا پینا، رہنا سہنا، سب طور طریقہ ہندوؤں کے اختیار کر لیے، اور عملاً بالکل ہندو ہو گئے یہود کے عروج و اقبال کے زمانے میں قبیلے کے قبیلے اُن کے ہمسایوں کے ایسے تھے، جو اسی طرز پر رفتہ رفتہ یہودیت میں داخل ہو گئے تھے۔ یا یوں کہیئے کہ یہودیت اُن کے اندر سرایت کر گئی تھی۔ حجاز کے شمال میں، نیز وسط میں ایسے عرب قبیلے متعدد تھے، جو اپنی عربیت چھوڑ، بے تکلف یہودیت میں غرق ہو گئے تھے ——

قرآن نے لحاظ اس نازک فرق کا بھی رکھا، اور جہاں کہیں موقع اِس قسم کے لوگوں کی تذکیر یا تنبیہ کا ہوا، وہاں بجائے اَلْيَهُوْدُ کے اَلَّذِيْنَ هَادُوْا ہی اِستعمال کیا۔

"نصاریٰ" کی تحقیق یہود کے علاوہ ایک دوسرے مذہبی فرقہ کا نام بھی قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اور وہ نصاریٰ ہے اکثر انگریز مترجمین قرآن نے (اور اُن میں بعض بڑے بڑے مشہور فاضل بھی ہیں) بے تکلف اِس کا ترجمہ انگریزی میں Christians سے کر دیا۔ اور اُردو میں بھی نصرانی کو مسیحی کا مرادف سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ اگر قرآن کو ذکر مسیحیوں کا کرنا ہوتا تو خود یہی لفظ وہ کیوں نہ لے آتا؟ اُسے چھوڑ خواہ مخواہ دوسرا لفظ کیوں تلاش کرتا؟ اصل یہ ہے کہ جس مت یا مسلک کا نام مسیحیت چل پڑا ہے، وہ مذہب نہ حضرت

جو یہودی بن گئے، جنھوں نے یہودیت اختیار کرلی۔ پھر وہی سوال کہ ایک مفہوم کے لیئے دو لفظ کیسے؟ ـــــــــــــ پھر وہی جواب کہ دونوں کا بعینہ ایک مفہوم ہی نہیں۔ یہ معلوم ہے کہ یہودی مذہب، مسیحیت اور اسلام کی طرح تبلیغی مذہب نہیں بلکہ ہندومت کی طرح نسلی مذہب ہے بنسل اسرائیل نے اپنے لئے جو قومی مذہب اختیار کیا، بس اسی کا نام یہودیت پڑگیا۔ اب ہوا یہ کہ گرد وپیش بہت سے لوگ نسلاً اسرائیلی نہ تھے، اس لئے باقاعدہ یہودی تو ہو ہی نہیں سکتے تھے لیکن یہود کا زمانہ اقبال کا تھا۔ اور اقبال کا اثر پڑوسیوں پر پڑنا لازمی ہے۔ یہود کے فنون اور صنعتوں سے، ان کی آسمانی کتابوں کے علوم اور حکمتوں سے، اور خود ان کی دولت وامارت کی چمک دمک سے ان ہمسایہ قوموں کی نظریں ایسی خیرہ ہوئیں، کہ انھوں نے بے اختیار طور طریقے، تہذیب ومعاشرت ؛

عقائد واعمال ان ہی کے اختیار کرلیئے، اور رفتہ رفتہ یہودیت کے اندر جذب ہوگئے، گم ہوگئے۔ جیسے آج سے کچھ روز پیشتر ہندوستان میں انگریزوں کے دور اقبال میں سیکڑوں ہندوستانی دیکھتے دیکھتے "صاحب بہادر" بن جاتے تھے۔ یا پھر خود انگریزوں اور انگریزنوں کی مثالیں بھی اسی ہندوستان میں ملیں گی کہ ہندو مذہب اور ہندو رسم ورواج ایسے پسند آئے کہ سناتن دھرم باضابطہ قبول کیئے بغیر انھوں نے

بھی ماننے والے شروع شروع میں نصرانی ہی کہلائے۔

اصلی انجیل پر روشنی یہ فرقہ ایک خاصی حد تک حضرت مسیحؑ کی تعلیمات پر قایم رہا، اور شرک سے تو بہرحال محفوظ رہا۔ اُس نے مسیحؑ کو مسیح اور نبی ہی مانا۔ نہ خدائی میں بقدر ____ شریک کیا، اور نہ خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ یہ فرقہ شام و اطراف شام میں تیسری صدی عیسوی تک اپنے اسی نام سے زندہ رہا۔ پھر اسے مخالفین حقارت سے ایبونیہ Ebonites کہنے لگے۔ (عبرانی میں اس کے معنی مفلس و نادار کے ہیں) مسیحی تاریخوں میں آتا ہے کہ کوئی دو صدیوں تک اور زندہ رہنے کے بعد یہ فرقہ، بہ حیثیت ایک مستقل فرقہ کے گم ہو گیا۔ یہ بھی لکھا ہوا موجود ہے کہ موجودہ انجیلوں کے علاوہ کوئی انجیل یونانی و لاطینی میں ترجمہ کی ہوئی نہیں، اپنی اصل زبان میں اس فرقہ کے پاس موجود تھی۔ اور عجب نہیں کہ حضرت مسیحؑ والی اصل انجیل وہی ہو۔

'صابی' کون تھے؟ یہود و نصاریٰ کے ساتھ دو جگہ قرآن میں ایک تیسرا نام اور بھی آیا ہے۔ صابیوں کا۔ اور ان دو فرقوں کی طرح اُنھیں بھی بعض حالات کے ماتحت نجات کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ یہ صابی کون تھے؟ اقوال ان کے باب میں مختلف نقل ہوئے ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشرکوں کا کوئی فرقہ تھا۔ حالانکہ یہ محال ہے کہ

مسیحؑ کا ہے، نہ اور کسی نبی برحق کا۔ حضرت مسیحؑ کے ساتھ اُس کی نسبت تو محض نام کی ہے۔ یہ مذہب چلایا ہوا پال یا پولوس طرطوسی کا ہے اور اُس کو حضرت مسیحؑ کی صحبت یا حواریت الگ رہی، زیارت بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ قرآن نے اس مذہب کا کوئی مرتبہ تسلیم نہیں کیا، بلکہ جہاں ذکر تثلیث پرستوں کا لانا منظور رہا ہے، وہاں عام کافروں کی طرح اُن کے حق میں بھی کفر محض کی صراحت کردی ہے، لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ یا لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وغیرہا۔ بہ خلاف اس کے اُس نے نصرانیت کی ایک خاص حیثیت مثل یہودیت کے اور اُس کی ہم سطح، تسلیم کی ہے۔ بلکہ ایک جگہ تو نصاریٰ کی گویا مدح بھی کی ہے، اور انہیں یہود اور مشرکین دونوں پر علانیہ ترجیح دی ہے نصاریٰ سے مراد اُس کی۔ حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ نہیں، نبی ماننے والا وہ قدیم فرقہ ہے، جو ابتدائی چند صدیوں تک موجود رہا۔ انگریزی میں اس کو Nazarenes کہتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کا وطن تھا ملک شام کے ضلع ارض جلیل کا قصبہ ناصرہ انگریزی تلفظ Nazareth اسی وطن کی نسبت سے حضرت مسیحؑ بھی یسوع ناصری مشہور ہوئے، جیسے آج قادیان کی نسبت سے مرزائے قادیانی۔ اور جس طرح آج مرزائے قادیانی کے ماننے والوں کا لقب بھی قادیانی پڑگیا ہے۔ حضرت یسوع ناصری کے

یا سرچارلس مارسٹن کے جدید تخمینہ کے مطابق سنہ ۱۴۴۱ ق، م، کہ اس قوم نے اپنے وطن اختیاری ملک مصر سے نکل، ہجرت کی اپنے ملک آبائی شام کی طرف مصر میں چین کے ساتھ چار ساڑھے چار سو برس سے رہتے چلے آرہے تھے، حضرت یوسفؑ کے وقت سے مگر اب فرعونی راج کی سخت گیریوں سے تنگ آچکے تھے۔ فرعون نام کسی فرد واحد کا نہیں، لقب ہے اُس عصر کے مصری ملوک وسلاطین کا۔ جیسے اب شاہ مصر "خدیو" کہلاتے ہیں، یا کچھ روز قبل جرمنی کے تاجدار "قیصر" اور روس کے "زار" کہلاتے تھے۔ فرعون کے لفظی معنی مصری زبان میں تھے، راع، دیوتا کے اوتار کے اور، راع، یا انگریزی تلفظ میں Ra مصر کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ ہندوستان کے سورج دیوتا اور ایران اور رومہ کے Mithra دیوتا کے مرادف۔

بہرحال اسرائیلی اب مصر سے چلے۔ حضرت موسیٰؑ بن عمران پیغمبر اُن کے رہبر و رہنما ہوئے۔ تعداد اُن کی حسب روایت توریت ۶ لاکھ تھی بوڑھے، بچے، مرد، عورت سب ملاکر۔ سڑکیں کچھ اُس زمانے میں آجکل کی سی صاف، شفاف، آئینہ کی طرح پڑی چمکتی ہوئی تو تھیں نہیں۔ پھر رات کا وقت اور تعاقب کی دہشت مستزاد۔ چلے تو راستہ بھول گئے۔ اور بجائے اس کے کہ شمال کی طرف ابھی اور بڑھتے چلے جاتے، اور اُس کے بعد اپنے

قرآن کسی مشرک فرقہ کی ہمت افزائی کسی درجہ میں بھی کرے۔ عراق و اہلِ عراق کے مذہبوں پر انگریزی کتابوں کے بہت سے ورق اُلٹنے پلٹنے کے بعد ابھی حال میں یہ کھلا کہ یہ اہلِ توحید کا ایک باطنی فرقہ تھا۔ عراق میں آباد پہلے یقیناً بڑی آبادی رکھتے ہوں گے۔ چند ہزار کی تعداد اب بھی باقی ہے۔ بصرہ، قطہ اور سوق الشیوخ وغیرہ میں۔ انگریزی میں اُنھیں Mandeans کہتے ہیں، اور عربی میں مندیہ۔ اور چونکہ توحید کے پوری طرح قایل ہیں، اسلئے لازمی طور پر سلسلۂ نبوت کے بھی۔ بعض انبیاء کو صراحت کے ساتھ مانتے ہیں۔ مثلاً حضرت یحییٰ علیہ السّلام کو۔ ایک مذہبی غسل، عیسائیوں کے بپتسمے کی طرح، اُن کے ہاں بھی بار بار ہوتا ہے، اور اِس مناسبت سے یہ مغتسل بھی کہلاتا ہے ——— اب جا کر قدر ہوئی امام ابو حنیفہؒ کے اِس فتوے کی، کہ صابیوں کا ذبیحہ بھی جائز ہے، اور اُن کی عورتوں سے شادی بھی۔ گویا عملاً یہ اہلِ کتاب کے حکم میں داخل ہیں۔ آخر امام صاحب بھی تو اِسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ خدا داد فراست، ذہانت، طبّاعی کے علاوہ مقامی واقفیت اور باخبری بھی آپ سے بڑھ کر کس کو ہوسکتی ہے؟

واقعۂ "خروج" بنی اسرائیل سے مفصل تعارف، کچھ قبل ہو چکا۔ اب آیئے، کچھ دیر اُن کا ساتھ ان کی دشتِ نوردیوں میں بھی دے لیں۔ ولادتِ مسیحؑ سے کوئی ڈیڑھ ہزار سال قبل کا زمانہ ہوگا،

L 485

پار کر گئی۔ لیکن جب اُس کی تقلید فرعونیوں نے کرنی چاہی، تو وہی پانی کی کھڑی ہوئی دیواریں پھر آپس میں مل گئیں، اور جس طرح پچھلی جنگ میں مشہور جہاز ٹائیٹنک Titanic باوجود ہر تدبیر و احتیاط کے غرقابی سے نہ بچ سکا تھا، فرعون اور فرعونیت کا سفینہ بھی ڈوب کر رہا!

مَنّ و سَلویٰ کا نزول۔

فلسطین ابھی دُور تھا۔ لیکن اسرائیلی اب جزیرہ نمائے سینا میں پہونچ چکے تھے۔ یہ وہ علاقہ ہے، جو ملک عرب اور بحر روم اور مصر اور فلسطین کے چوراہے پر واقع ہے۔ اور اسرائیلی اسی علاقہ میں سالہا سال اپنے خیمے ڈیرے لیئے ہوئے آج یہاں، کل وہاں، خانہ بدوش اور بدویانہ تمدن کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ اِس نیم متمدن زندگی میں کھانے پینے کے سارے انتظامات کہاں ممکن تھے؟ حالانکہ مصر میں رہ کر یہ خوگر انھیں کے ہو چکے تھے۔ لیکن قدرت کے انتظامات ہر بشری تدبیر پر غالب اور ہر انسانی عقل سے ماوراہی ہوتے ہیں۔ اِس علاقہ کا ایک خاص پرندہ بٹیر ہے۔ بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آتا ہے۔ اُڑتا اُونچا نہیں، بہت نیچا رہتا ہے زیادہ اُڑنے کا دَم بھی نہیں رکھتا، تھک کر جلد نیچے گر جاتا ہے۔ غرض شکار کر لینا اُس کا ہر حیثیت سے آسان۔ شمالی سفر اِس کا مصر سے فلسطین

داہنے ہاتھ کو، یعنی مشرق کی طرف مڑتے، اور اس طرح خشکی ہی خشکی فلسطین پہنچ جاتے، یہ پہلے ہی سے مشرق کی طرف مڑ گئے۔ اب سامنے سمندر تھا۔ سمندر سے مراد دریائے نیل نہیں، جو اسرائیلی آبادی کے علاقے جاشان (Goschen) سے مغرب جانب تھا۔ بلکہ مراد ہے بحر قلزم۔ یا اور زیادہ صحیح پتہ جاننا چاہیئے، تو بحر قلزم کے شمالی سرے کا وہ مغربی دوشاخہ جس کے بعد اب نہر سویز شروع ہو جاتی ہے اور اس وقت خشکی تھی۔

فرعون کی غرقابی یہاں پہونچے ہی تھے، کہ پیچھے سے اسپریل فوج کے دستوں نے آلیا۔ مصریوں کا لشکر جرار موجود اور خود ہز اسپریل ہیجنٹی فرعون مصر اس کے کماندار۔ گھوڑوں کے فوجی رتھ اور گھوڑے اس وقت کے خاص جنگی سامان تھے، یہ سب حاضر۔ اعداد ان کے توریت میں دیئے ہوئے ہیں۔ اسرائیلی اسی حیص وبیص میں تھے۔ کہ اب کیا کریں اور کہاں اپنے کو چھپائیں، کہ اشارۂ غیبی پا، اُن کے رہبر اور خدا کے پیغمبر حضرت موسیٰ نے بے تکلف قدم سمندر میں ڈال دیا، اور آپ کے نقش قدم پر آپ کی ساری قوم بھی ہولی۔ سمندر نے راستہ دیدیا۔ پانی پھٹ کر بیچ میں خشکی ہو گئی۔ اب بھی زلزلہ کے اثر سے دریا کا پانی کئی کئی منٹ بالکل غایب ہو جاتا ہے، بہرحال بحری زلزلہ ہو یا کوئی اور سبب اس سے بھی خفی تر، مسبب الاسباب کی تائید غیبی سے قوم اسرائیل سمندر

بعض خطّے تو بالکل ہی بے آب وگیاہ تھے۔ خشک محض۔ چلتے چلتے ایک بار قیام ایک ایسی منزل پر ہوا، جہاں کھانا تو کھانا، پانی تک نظر نہ آیا۔ پیاس کی شدت جیسی ہوئی ہوگی۔ ظاہر ہے۔ نام اس مقام کا توریت میں حُرب انگریزی تلفظ میں Horeb سب نے آکر گھیر لیا اپنے رہبر و پیمبر کو۔ مُلاّ کی دوڑ مسجد۔ بندہ کا سہارا دُعا، موسیٰ نے دُعا کی اُس حاجت رواسے، جس پر ہر پہاڑ کا جوف اور ہر پتھر کا بطن آئینہ ہے۔ حکم ہوا کہ اِس وادی کو ہماری رحمت کے چشموں سے محروم نہ سمجھو۔ سامنے کی چٹان پر جاؤ، اُس پر اپنے عصا کی ضرب لگاؤ، پھر دیکھو کیسا پانی اُبلتا ہے۔ آپ گئے۔ تعمیلِ ارشاد کی۔ پانی نکلا، اور نکلا بھی تو اِس تجلّی حکمت کے ماتحت، کہ ایک نہیں پورے بارہ۱۲ دھارے پھوٹ بہے! —— ٹھیک بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی مناسبت سے!

توریت میں ذکر تعداد کا نہیں، اس لئے قرآن کے معترضین و معاندین بول اُٹھے کہ قرآن نے یہ ذکر بارہ کی تعداد کا کہاں سے کردیا! خدا کی شان کہ اگلوں کے اس اِنکار کا جواب پچھلوں نے اپنی تصدیق سے دیدیا۔ جارج سیل قرآن مجید کا پُرانا انگریز مترجم ہے۔ اس مقام پہ پہنچ کر اپنے حاشیہ میں لکھتا ہے:۔

"ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے، صراحت سے

کی طرف عموماً مارچ میں ہوتا ہے، اور جنوبی سفر فلسطین سے مصر کی طرف عموماً نومبر میں۔ عربی میں اسی جانور کو سلویٰ کہتے ہیں۔ اسرائیلیوں کو یہ نعمت گھر بیٹھے ملنے لگی۔ نہ طویل سفر کی دقتیں، نہ سامانِ شکار تیار کرنے کی زحمتیں۔ آرام سے اپنے پڑاؤ میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ بٹیر آکر خود بخود گرنے لگے۔ اور یہ لگے انھیں پکڑنے اور بھون بھون کر کھانے۔ مارچ واپریل میں اپنی شمالی پرواز پر رات کے وقت ہوتے تھے۔ سمندر کی تیز ہواؤں کے تھپیڑے انھیں بآسانی اسرائیلی کیمپ تک پہونچا دیتے گوشت ان کا چربی دار ہوتا۔ رکھنے سے جلد خراب ہو جاتا، تازہ ہی کھانے کے قابل ہوتا۔ اس لذیذ سالن کے ساتھ ساتھ ایک اور انتظام بھی ان کے لئے قدرت کے مطبخ سے ایک خاص قسم کی روٹیوں کا ہو گیا۔ ایک چیز ہوتی ہے منّ۔ یہی نام عربی میں بھی ہے اور یہی اسرائیلیوں کی زبان میں بھی۔ سفید سفید دیکھنے میں گوند کی سی۔ لیکن مزے میں بہت اچھی۔ رات کو اوس کے بعد یہ بھی درختوں پر گرتی، اور صبح کو پتّوں پر اس کی ٹکیاں جمی جمائی کھانے کو مل جاتیں —— یہ چیز بالکل نایاب اب بھی نہیں ہوئی ہے۔ ان علاقوں میں کچھ نہ کچھ اب بھی مل جاتی ہے۔

بارہ چشمے | سینا کا علاقہ زیادہ متمدّن اور سر سبز تو کہیں بھی نہ تھا، لیکن

لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں، اور اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے
تو دس۔ سب سے پہلے قرآن نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے
بارہ۱۲ قبائل کے لیئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ
اشارہ انھیں شگافوں کی طرف ہے۔" (صفحہ ۳۶ و ۳۷)

صدی دو صدی نہیں، ۳۳، ۳۴ صدیاں گزر جانے کے بعد اگر شگافوں کے دورویہ نشان بجائے ۲۴ کے ۲۰ یا ایک رویہ نشان بجائے ۱۲ کے ۱۰ رہ گئے ہوں، یا دیکھنے والے کو اتنے ہی نظر آئے ہوں، تو یہ بیان قرآنی کی عین تائید و توثیق ہی ہوئی!

بت شکن یہود کو سزا اسرائیلیوں کے ساتھ دشت پیمائی سے طبیعت ملول ہو گئی ہوگی۔ اس قوم کے عہد ترقی و تمدن کی طرف آیئے۔ قرآنِ مجید اس قوم کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِيۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡكُمۡ فِى السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِـئِيۡنَ ‌ۚ‏

تم اپنے لوگوں میں سے ان سے تو خوب واقف ہی ہو، جنھوں نے سبت کے بارے میں احکام سے تجاوز کیا تھا، سو ہم نے انھیں حکم دیا کہ بنجاؤ ذلیل بندر۔

بیان کرتا ہے کہ چٹان سے پانی بارہ مقامات
سے نکلا تھا؟

اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ نقل کرتا ہے :-

"چٹان میں اِس وقت بھی چوبیس سوراخ موجود ہیں،
۱۲، ایک پہلو پر ہیں، اور بارہ اُن کے مقابل جانب"

یہ شہادتیں سترہویں اور اٹھارویں صدی کی تھیں، انیسویں صدی میں دنیائے مسیحیت کے ایک اور ممتاز رکن پادری ڈین اسٹینلی DeanStanley ہوئے ہیں۔ صدی کے وسط میں ارض تورات کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لئے بہ نفس نفیس سفر کیا، اور اپنے مشاہدات و تحقیقات کو ایک مستقل تصنیف Sinai and Palertive کے نام سے شایع کیا۔ قرآن کی نہیں، بائبل کی تائید و نصرت میں۔ اس میں اِس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :-

"یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے
آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے۔ راس سفسفہ کے قریب
لیجا LeJa کی وسیع وادی میں واقع ہے۔ شگاف
اور رخنے جا بجا پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ مٹے ہوئے
ہیں، کچھ بڑے ہیں، کچھ چھوٹے۔ گنتی میں اگر سب کو

دونوں کے مشرقی ساحلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اِس لیئے وہ مقام بھی جہاں یہ واقعہ پیش آیا، یہیں کہیں ہوگا۔ اِسلامی روایتوں میں نام ایلہ کا آیا ہے اور توریت میں ذکر ایلات Elath کا آتا ہے یہ ایک بندرگاہ تھا خلیج عرب کا علاقہ اودم Edom میں۔ اور یہ واضح رہے کہ خلیج عرب خود نام ہے بحر قلزم کے شمالی مشرقی شاخسانہ کا۔ اَب نقشہ میں اِن ناموں کا کوئی شہر نہیں ملتا۔ نہ ہمارے مفسرین کے ایلہ کا، نہ بائبل کے ایلات کا۔ جغرافیہ کی اصطلاحیں بھی آخر ابدیت لیئے نہیں ہوتیں۔ ۲۹ صدیوں کے بعد جغرافی نام اگر اپنی قدیم صورتوں میں نہ باقی رَہ جائیں، تو یہ کوئی اَنوکھی بات نہیں۔ اَب نقشہ پر جو نظر دوڑائیے تو اس میں بحر قلزم کے شمالی حصہ کا جو شرقی دو شاخہ ہے اُس کے ساحل پر ایک مشہور بندرگاہ عقبہ پر نظر پڑیگی یہی عقبہ پرانی بولی میں ایلات یا ایلہ تھا۔ درمیان میں رومیوں کے عہد حکومت میں کچھ اور نام بھی رَہ چکا ہے۔

زمان و مکان کے اس تعین کے بعد قدرۃً سوال نفس واقعہ کی کیفیت و وقوع سے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ یعنی آیا مسخ جسمانی ہوگیا تھا، جیسا کہ قرآن کی ظاہر عبارت سے مترشح ہوتا ہے، اور عموماً اہل تفسیر نے اِسی پہلو کو اختیار کیا ہے، یا مسخ ذہنی و اخلاقی حدود تک رہا تھا، جیسا کہ مجاہد تابعی کا قول شروع سے نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ سو اس کے جواب میں قرآن کے

سبت کہتے ہیں ہفتہ کے ساتویں دن، شنبہ یا سینچر کو۔ شریعت یہود میں یہ دن ایک بڑا مقدس دن تھا۔ اور تقدس کے معنی یہ تھے کہ اس روز سارا دنیوی کاروبار بند رہے (اور اس میں شکار کھیلنا بھی آگیا) اور یہ دن تمامتر عبادت الٰہی کے لئے وقف رہے۔ یہود اِس قانون کو بار بار توڑتے تھے۔ مچھلی کا شکار ایک حیلہ کے ساتھ اس روز بھی کیا کرتے تھے۔ آخر میں اُنھیں اپنی اِس قانون شکنی کا خمیازہ بہ صورت عذاب بھگتنا پڑا۔ آیت قرآنی میں تذکرہ اسی عذاب کا ہے۔ لیکن تفصیل اِس کی نہ قرآن میں درج ہے، نہ تاریخ میں نظر سے گزری۔ روایتوں سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ واقعہ حضرت داؤدؑ کے زمانے کا ہے۔ وہ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی اُن کا سال وفات ۹۶۲ ق۔م ہے۔ اُن کے عہد کی مفصل و مکمل تاریخ محفوظ نہیں۔ اِس لیئے اگر اور بہت سے واقعات کی طرح اس کا تذکرہ بھی گم ہوگیا ہو، تو کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں۔

روایتوں میں ذکر مچھلی کے شکار کا بار بار آیا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ مقام کوئی لبِ سمندر ہوگا۔ اور قیاس کی حاجت بھی نہیں، خود قرآن ہی نے دوسری جگہ کَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ کہہ کر اُسے صاف کردیا ہے۔ حضرت داؤدؑ کا رقبۂ سلطنت، تاریخ کے طلبہ کو معلوم ہے کہ بحر روم (Mediteranian) اور بحر قلزم Red sea

مَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوا کفر سلیمان نے تو نہیں کیا، البتہ شیطان کفر کیا کرتے تھے۔

لیکن یہ بات کیا ہوئی؟ قرآن تو خود ہی اُن کے نبی اور برگزیدہ ہونے کی شہادت بار بار، صاف صاف دے رہا ہے اور اب یہ کہہ رہا ہے کہ وہ کافر نہ تھے۔ نبی کو جو کافر سمجھے وہ خود ہی کافر۔ اور بالکل ظاہر ہے کہ جو منصبِ نبوت سے سرفراز ہوگا، اسے کفر سے نسبت کیا؟ یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہوئی کہ شاہ انگلستان کسی کو وایسرائے ہندوستان کا بنا کر بھیجیں، اور پھر یہ بھی اعلان کرنے لگیں کہ وہ باغیوں اور غداروں میں نہیں! —— تو کیا قرآن نے حشو بھی اپنے اندر جائز رکھا ہے؟

اِس منزل پر پہنچ کر اِس حقیقت کو یاد کر لیجیے کہ قرآن سے قبل دو اور قومیں نبوت کا کلمہ پڑھتی ہوئی اِس دنیا میں آباد ہو ئی تھیں، اور اُس وقت تک آباد تھیں۔ ایک یہود دوسرے نصرانی۔ اِن دونوں نے ایک طرف تو سلیمانؑ بن داؤدؑ کا شمار انبیاء میں کیا، اُن کے نام کے صحیفہ کو اپنے صحائفِ آسمانی کے مجموعہ میں جگہ دی۔ اور دوسری طرف ان کی بدکرداری اور فسق کا ڈھول اس زور سے پیٹا، کہ اُنھیں دائرۂ ایمان و حلقۂ توحید ہی سے خارج کر دیا اور آج تک خارج کئے ہوئے ہیں یہود کی ایک تازہ مستند کتاب ویلنٹائن کی ایک جلدی جیوش

متعلم کو زیادہ کرید کی حاجت ہی نہیں۔ قرآن، واقعہ کے نفس وقوع کی خبر پہلی بار اپنی ذمہ داری پر نہیں دے رہا ہے۔ صرف ایک مُسلّم و متعارف واقعہ کی یاد دہانی مخاطبین کو کر رہا ہے۔ مجرم سے اِشارہ اُس کے ایک پچھلے اور اتفاقی جرم کی جانب کر رہا ہے۔ عنوانِ بیان ملاحظہ ہو۔ لَقَدْ عَلِمْتُمْ۔ عَلِمْتُمْ خود ہی کافی تھا۔ یعنی تم تو علم رکھتے ہو، واقعہ تمہارا جانا بوجھا ہوا ہے، کوئی سنی سنائی روایت یا افواہ نہیں۔ پھر اس پر تاکید اور وہ بھی دوہری، ل کے ساتھ بھی اور قد کے ساتھ بھی! یعنی وہ واقعہ جس سے تم خوب اچھی طرح واقف ہو۔ اس سے انکار کیا معنی، اِس میں شک و شبہ کی بھی گنجایش نہیں ——— بس اب اس سے زیادہ تفصیل سے کسی کو بحث کیا، وہ جس صورت اور جس کیفیت کے ساتھ بھی پیش آیا ہو، بہرحال تھا تاریخ اسرائیل کا کوئی معلوم و معروف واقعہ۔ اور اسی سے تو قرآن کے معاصرین کو اس پر زبان کھولنے کا حوصلہ نہ ہوا!

کفر سلیمانی سے انکار داؤدؑ نبی کے بعد اُن کے فرزند و جانشین سلیمانؑ نبی کی طرف آیئے۔ سال وفات ۹۳۳ھ ق۔ م۔ قرآن اُن کے بارے میں کہتا ہے، جیسے کسی اہم واقعہ کی خبر دے رہا ہو، کہ

"اس کی عیاشی اور غیر کفو بیویوں کی رضا جوئی نے بت پرستی
تک اُس کی نوبت پہنچا دی۔ گو بعض کا خیال ہے کہ اُسے
آخر وقت توبہ نصیب ہو گئی تھی" (صفحہ ۹۱۲)

اور یہ فتوے اُن مشائخ یہود و آبائے کلیسا کے کچھ طبع زاد نہ تھے جن نوشتوں کو یہ صحائف آسمانی قرار دیئے ہوئے ہیں، اُن تک میں یہہ تصریحات موجود ہیں:

"جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اُس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا۔ اور اُس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا" "سو از بسکہ اُس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا اِس لیئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اُس نے اُسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اُس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا" (ا۔ سلاطین ۱۱: ۹ و ۱۰)

"خدا نے اُسے تمام اسرائیل کا بادشاہ کیا تو بھی اجنبی عورتوں نے اُسے بھی گنہگار کیا" (نحمیاہ، ۱۳ و ۲۶)

نمونہ کے لیئے یہ چند تصریحات کافی ہیں۔ کُل کہاں تک سُنیئے گا۔ ان کے سننے کے بعد بھی کیا یہ خیال باقی رہے گا، کہ قرآن نے بلا ضرورت خواہ مخواہ

Valentine's One Volum Jewish Encyclopedia انسائیکلو پیڈیا میں ہے:۔

" سلیمان نے حکمرانی ایک مشرقی فرماں روا کی شان
وشوکت سے کی اور انھیں کمزوریوں کے ساتھ بھی۔
یعنی عورتوں سے عشق، عالیشان عمارتیں اور پرتعیش
طرزمعاشرت۔ یہی چیزیں آخرتباہی لائیں۔ پھر پرتعیش
زندگی کے لئے ٹیکس بھی بھاری لگانے
پڑے " (صنا٦)

دوسری بارہ۱۲ جلدوں والی ضخیم جیوش انسائیکلوپیڈیا میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے۔ اور اسرائیلیوں کے بڑے قدیم مورخ جوزلفیس نے تو فسق وفجور ہی کو نہیں، صاف صاف ارتداد، شرک وبُت پرستی کو آپ کی جانب منسوب کردیا ہے!۔

رہے مسیحی، تو اُن کے کلیسا میں مدتوں زور و شور سے بحث اِس مسئلہ پر جاری رہی کہ سلیمان کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ اور سینٹ آگسٹائین اور بہت سے آبائے کلیسا نے سوال کا جواب نفی ہی میں دیا! (ملاحظہ ہو ہیسٹنگز کی "ڈکشنری آف دی بائبل" جلد ۴۔ صـ٥٦ حاشیہ۔)
اور رومن کیتھولک گروہ کی مستند کتاب کیتھولک ڈکشنری میں آج تک یہ لکھا چلا آرہا ہے کہ (مسلمان ناظرین اس "نقل کفر" کو معاف فرمائیں)۔

یہ سحر و کہانت کے ماہرین برابر آپؑ کے خلاف تہمتیں تراشتے رہتے، اور غدر و بغاوت پھیلایا کرتے۔ توریت کے صحیفۂ سلاطین، حصہ اول کے دو باب ۱۱ و ۱۲ انھیں کے قصّوں سے لبریز ہیں۔ ہمارے مفسرین و متکلمین میں سے بعض کا خیال انھیں کی طرف گیا ہے۔

غرض قرآن نے سلیمانؑ کی صفائی کا اعلان کیا، بڑے پُر قوت دعووں کے مقابلے میں کیا۔ اور دُنیا نے، مخالفین و معاندین کی دنیا نے، قرآن ہی کی آواز کو سُنا۔ یہاں تک کہ اِس بیسویں صدی عیسوی میں اہل کتاب کے جو محققین اور اسکالرز ہیں، اُن کے قلم سے تصدیق و تائید، بائبل کی نہیں قرآن ہی کے بیان کی نکل رہی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے آخری یعنی چودھویں ایڈیشن میں جو مقالہ Solomon پر ہے اُس میں صاف الفاظ میں تائید اُن کے موحد ہونے کی ہے Solomon was a sincere worshipper of Jahwa سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے۔" (جلد ۲۰ صہ ۹۵۲)۔

اور اس سے چند سال قبل خاص بائبل ہی کی انسائیکلوپیڈیا، چار جلدوں میں، بائبل کے محققین اور ماہرین کے قلم سے شایع ہوئی تھی، اس میں تو یہاں تک صراحت ملتی ہے، کہ بائبل کی جن عبارتوں میں سلیمانؑ کے کفر و شرک کا ذکر موجود ہے، وہ خود الحاقی یا جعلی ہیں؛ اور اُس کے بعد یہ کہ:

ایک بات کہہ ڈالی!

ضرورت اس کی شدید تھی۔ فرد جرم کس ڈھٹائی اور زور کے ساتھ لگ چکی تھی۔ اور یہ الزامات لگانے والے غیر اور بیگانے نہیں، سلیمان ؑ کے اپنے اور یگانے ہی تھے! صفائی بھی اُسی قطعیت و زور کے ساتھ پیش ہونی لازمی تھی۔ قرآن کا مقصود اسی اتہام کی تردید تھی ——— اور یہ محض ظن و قیاس نہیں۔ تفسیر ابن جریر میں، ایک نہیں دو دو روائیتیں اس مضمون کی منقول ہیں۔ کہ جب قرآن میں ذکر حضرت سلیمان ؑ کا بہ سلسلہ انبیاء آیا، تو اُس وقت کے مشائخ یہود نے بہ طور طنز کہا، کہ دیکھو تو سہی، محمدؐ نے ایک ساحر کو پیمبر بنا دیا! ——— اب آیت کے الفاظ دوبارہ پڑھیے۔ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا۔ صدیوں سے جو الزام تم سلیمان ؑ پر لگا ہوا سُنتے آرہے ہو، یہ سب غلط و خرافات ہے۔ شرک اور بت پرستی الگ رہی، اُن سے تو کوئی کفریہ حرکت بھی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ کفریہ اعمال تو شیاطین کے تھے خود ایسی حرکتیں کرتے تھے، اور رکھ دیتے تھے سلیمان پر!۔

پُرزور صفائی | شیاطین، (بہ صیغۂ جمع) سے مراد محاورۂ قرآنی میں شیاطین اِنس بھی ہوتی ہے، یعنی شیطان صفت انسان۔ حضرت ؑ کے زمانے میں اِن فتنہ پرداز مفسدوں کی کثرت ہوگئی تھی

مُلْكِ سُلَيْمَانَ ؕ اور پھر چند لفظوں کے بعد وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ تشریح دونوں فقروں اور پوری آیت کی یہ ہوئی، کہ یہ یہود رسول کی تعلیمات پر تو کان دھرتے نہیں، قرآن کی آواز تو سنتے نہیں۔ یہ پیچھے لگے ہوئے ہیں اس سحر کے جو شیاطین عہد سلیمان میں کرتے تھے۔ (اہل لغت نے تصریح کر دی ہے کہ علیٰ ملک سلیمان بمعنی فی ملک سلیمان کے ہے) اور اس سحر کے بھی پیچھے لگے ہیں جو بابل میں دو فرشتوں پر کسی مصلحت تکوینی سے اتارا گیا تھا۔

قرآن کو مقصود یہاں یہود کی محبت و مناسبت سحر کے ساتھ بیان کرنا تھی۔ لیکن ضمناً یہ بھی کہہ گیا، کہ سحر دو رائج تھے۔ ایک سحر حضرت سلیمانؑ کے ملک والا یعنی سحر فلسطینی، اور دوسرا سحر بابل۔ اور یہود ان دونوں میں سے بند کسی میں نہ تھے۔ اب گویا تین باتیں الگ الگ ہوئیں:-

ایک، یہود کا سحر پیشہ ہونا، سحر پر حریص ہونا۔

دوسرے، سحر کا ایک مرکز فلسطین ہونا۔

تیسرے، سحر کا ایک مرکز بابل ہونا۔

امر اوّل کی شہادت خود یہود ہی کے صحائف مقدس میں موجود ہے۔ بائبل کی کتاب سلاطین، ۲ میں ہے:-

"اور انھوں نے اپنے بیٹے بیٹی کو آگ کے درمیان

"یہ تو غالباً صحیح ہو کہ سلیمان کے حرم متعدد تھے۔ اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی۔ لیکن انھوں نے نہ تو عبادت گاہیں ہی سب کے لیئے تیار کرائیں، اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش جمع ہونے دی" (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا۔ کالم ۴۶۸۹)۔

اسی طرح ہیسٹنگز کی پانچ ضخیم مجلدات والی ڈکشنری آف دی بائبل میں ہے:۔

"یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ بادشاہ نے خدائے واحد پر سے اپنا ایمان ترک کر کے شرک اختیار کر لیا ہو۔ البتہ اِس شہرت کے اسباب آسانی سے سمجھ میں آ سکتے ہیں"

(جلد ۴ صفحہ ۵۶۷)

ایک اُمّی کے لائے ہوئے علوم پر ایسی برجستہ گواہیاں، علمی دُنیا کا بجائے خود ایک معجزہ ہیں!

سحر بابل۔ کفرِ سلیمانؑ ہی کے سلسلہ کی ایک چیز یہود کا شغلۂ سحر و کہانت ہے۔ قرآن اپنے معاصر یعنی چھٹی صدی مسیحی کے یہود عرب کے ذکر میں کہتا ہے۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى

ماہر ہوتے تھے ..... اور عوام تو جادوگری پر فدا تھے"۔
(جلد ۸ ۔ صفحہ ۲۵۵)

یہ ذکر آغاز اسلام سے بہت قبل کا ہے۔ بعد آغاز اسلام یعنی نزولِ قرآن کا ماجرا، محب اسلام نہیں، دشمن اسلام یہودی النسل، آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیس کی زبان سے سنئے:۔

" وہ لوگ [یعنی یہود عرب] سحر کے ماہر تھے، اور بہ مقابلہ کھلم کھلا قتال کے سفلی عملیات کو زیادہ پسند کرتے تھے"۔ (سیرۃ نبوی پر کتاب محمد۔ صفحہ ۱۸۹)

فلسطینی سحر تو انھیں آبائی ورثہ میں ملا تھا، رہا سحر بابل، سو وہ ان شوقینوں نے اپنے شوق سے سیکھ لیا تھا۔ بابل سے مراد وہ ملک ہے جو آج عراق کہلاتا ہے، اور کسی زمانے میں کلدانیہ کہلاتا تھا۔ انگریزی میں اسی کو کالڈیا کہتے ہیں۔ اس کے جو مذہبی کتبے آج برآمد ہوئے ہیں، وہ تمام تر سحریات، سفلیات، عملیات سے لبریز ہیں۔ اس کا سحر ضرب المثل ہے یہاں تک کہ انگریزی زبان میں کلدانی Chaldean مرادف ہوگیا ہے ساحر کے۔ اور محاورہ میں اس فقرہ He is a Chaldean کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ ساحر ہے۔ بابل جب تباہ ہوا تو اس کے باشندے ادھر ادھر منتشر و متفرق ہو گئے۔ جہاں جہاں گئے، قدرۃً اپنے علوم سحر و

گزارا۔ اور فال گیری اور جادوگیری کی ..... ان باعثوں سے خداوند بنی اسرائیل پر بہت غصّہ ہوا، اور اپنی نظر سے گرا کر دور کر دیا۔" (۱۷: ۱۷ و ۱۸)

اور صحیفۂ میکاہ Micah میں اسرائیلیوں کے مبارک ایام اقبال کی پیشینگوئیوں کے سلسلۂ میں ہے:-

"تیرا ہاتھ تیرے دشمنوں پر بلند کیا جائے گا اور تیرے سارے مخالف نیست ہو جائیں گے۔ اور اسی دن میں یوں ہوگا خداوند فرماتا ہے، کہ .... میں تیرے ہاتھ کی جادوگریاں منقطع کروں گا۔ اور تیرے یہاں ساحر پھر نہ ہوں گے۔" (۵: ۱۰ و ۱۲)

یہ صرف دو حوالے پیش کیئے گئے، ورنہ یہود کی ساحری، جادوگری، فال گیری وغیرہ کے تذکروں سے تو اُن کے صحائفِ مقدّسہ کے ورق کے ورق رنگین ہیں۔ اُن کے ہاں کے جدید مستند ترین مخزنِ معلومات جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:-

"جادوگری سارے قدیم بنی اسرائیل میں پھیلی ہوئی تھی .... سحر کا علم عدالت العالیہ کا رکن بننے کے لیئے لازمی تھا۔ بڑے سے بڑے علماء سفلیات کے

کن کن اغراض کے لیئے ہوتے ہیں، ذرا انھیں تفصیل سے بیان کیجیئے، جب تو ہم سمجھیں ——— فقہ کی کتابوں سے جرائم کے، اور طب کے رسالوں سے بداخلاقی کے سبق لینے والے کیا آج بھی کثرت سے موجود نہیں؟ ——— تو غرض یہ کہ ان حیلوں، تدبیروں اور چالاکیوں سے یہ فرشتوں کی زبان سے بھی جرائم و معاصی کی تعلیم حاصل کر لیتے! اور فرشتے بیچارے اپنی زبان سے یہ کہتے ہی رہ جاتے، کہ ہم تو ذریعہ آزمایش بنا کر بھیجے گئے ہیں (نَحْنُ فِتْنَةٌ) کہیں ہم سے الٹی تعلیم بدی و بدکرداری کی نہ حاصل کرنے لگنا (فَلَا تَكْفُرْ)

خیال نہ گزرے کہ سحر جیسی گندی چیز کے لیئے لفظ 'نزول' و 'انزال' کیسا (وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ) اس سے تو فی الجملہ عظمت نکل رہی ہے سحر کی! ——— وہم بے بنیاد ہے۔ نزول تکوینی کے سلسلہ میں تو یہ لفظ بیماری، موت، قحط، خشکسالی، یہاں تک کہ عذاب و بلا، سب کے لیئے عام ہے۔ اور محاورۂ قرآنی میں اس کا استعمال روزی (رزق) اور پوشاک (لباس) کے لیئے بھی ہوا ہے، اور پانی (ماء) لوہے (حدید) اور چوپائے (انعام) کے لیئے بھی ——— اور جرائم سے گہری واقفیت تو بعض اوقات خود مجرم سے بڑھ کر پولیس اور مجسٹریٹ کو ہوتی ہے، اور مرض کے شدائد سے واقفیت مریض سے بڑھ کر طبیب کو:-

کہانت کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ یہود پہلے ہی سے اس رنگ میں رنگے ہوئے تھے، بڑھ کر اہل بابل کا استقبال کیا۔ اور بہترین شاگرد اِن استادوں کے ثابت ہوئے۔ جیوش اِنسائیکلوپیڈیا میں ہے:۔

"یہود نے ہر حصۂ ارض میں بابل کا ادب و احترام جاری رکھا" (جلد ۲۔ صفحہ ۴۱۴)

ہاروت و ماروت ہاروت و ماروت کے فرشتہ ہونے سے، اور اُن پر سحر نازل ہونے سے، طبیعت کو وحشت بالکل نہ ہو۔ جب کسی قوم میں سحر و کہانت کا شمار علوم عالیہ میں ہونے لگے، سحر و کہانت اور نبوت و رسالت کے درمیان التباس ہونے لگے اور لوگ نبی کی نبوت سے اِنکار کر کے اُسے بے تکلف ساحر قرار دینے لگیں، تو اس صورتِ حال میں یہ بات بالکل دل کو لگتی ہوئی ہے کہ قوم کو اِس باب میں راہ ہدایت دکھانے اور سحر و نبوت کے درمیان فرق سمجھانے کے لئے جنس انبیاء سے علاوہ کوئی اور مخلوق بھیجی جائے۔ دو فرشتے، اِنسانی لباس میں، اس غرض سے اُس مرکزِ سحر اور مستقر کہانت میں بھیجے گئے۔ لوگ اُن کے پاس آتے۔ یہ اُنھیں رائج الوقت کفریات سے روکتے، منع کرتے سمجھاتے بجھاتے۔ اَب اُن میں جو بدفطرت ہوتے، وہ اِس قسم کے سوالات کرید کرید کر کرتے، کہ سحر کہتے کسے ہیں، عملیاتِ سحری ہوتے کیا کیا ہیں،

تمھارے نبیوں کو کھا گئی ہے۔" (یرمیاہ۔ ۲: ۳۰)

"اور خداوند اُن کے باپ دادوں کے خدا نے اپنے
رسولوں کی معرفت سے اُن کے پاس پیغام بھیجا......
لیکن اُنھوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھے میں اُڑایا
اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اُس کے نبیوں سے
بدسلوکی کی، یہاں تک کہ خداوند عالم کا غضب اپنے لوگوں
پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔" (۲۔ تواریخ۔ ۳۶: ۱۵ و ۱۶)

انجیلوں میں حضرت مسیحؑ کی زبان سے صراحتیں اس سے بڑھ کر موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو انجیل متی۔ ۲۳: ۳۱ و ۳۷۔ نیز انجیل لوقا۔ ۱۳: ۳۴

شہادتِ یحییٰؑ

حضرت یحییٰؑ اس قوم کے آخری نبی ہیں (بجز حضرت عیسیٰؑ کے) تھے۔ عہدِ قبل تاریخ کی تاریکیوں میں نہیں، تاریخ کی روشنی کے زمانے میں تھے۔ بادشاہِ وقت ہیروڈ نے اپنی حسین بیوہ بھاوج کو اپنی ملکہ بنا لیا تھا۔ حضرت یحییٰؑ نے آکر اس تعلق پر نصیحت اور ملامت کی۔ ملامت بادشاہ سے زیادہ ملکہ کو ناگوار گزری۔ ناصح جیل بھجوائے گئے۔ بادشاہ کی سالگرہ کا دن آیا۔ بادشاہ دل میں اُنھیں بے قصور سمجھ ہی رہا تھا، ارادہ کیا کہ آج جشن کی خوشی میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ اُنھیں بھی رہا کر دوں گا۔ بزمِ نشاط میں بیٹھا، تو اتفاق سے

یہود اور قتل انبیاء قرآن کی عدالت میں بنی اسرائیل مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ اور ایک طویل فردِ جرم انھیں سنائی جا رہی ہے۔ اِس میں بار بار یہ ذکر آتا ہے کہ اس قوم نے اپنے انبیاء کے ساتھ جبر اور بدسلوکیاں جو کیں وہ تو کیں ہی، باقی بعض اوقات انھیں قتل تک کر ڈالا ہے! الزام ہے یقیناً سنگین اور قومی ضمیر کو تھرّا دینے والا۔ لیکن ساتھ ہی اِتنا جچا تُلا، کہ تاریخ کی زبان کو اِنکار پر کھلنے کی گنجایش ہی نہیں۔ قتل اشعیاہ Isuiah نبی کا، قتل یرمیاہ Yremiah نبی کا، قتل ذکریا Zacharias نبی کا، قتل یحییٰ Yahua نبی کا، اور سب سے آخر میں اقدام قتل عیسیٰ مسیح کا۔ یہ چند عنوانات جلی ہیں اسرائیل کی تاریخ سفاکی و بہیمیت کے!

شہادت خود انھیں کے صحائف مقدس کی سنئے:۔

"وہ نافرمان نکلے اور تجھ سے پھر گئے۔ اور انھوں نے تیری شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا؛ اور تیرے نبیوں کو جو اُن کو نصیحت دیتے تھے کہ انھیں تیری طرف پھر لائیں، قتل کیا، اور انھوں نے اپنے کاموں سے تجھے غصّہ دلایا۔" (نحمیاہ ۹: ۲۶)

"تمھاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کے مانند

پھر کیا لفظ حشو ہے؟ ـــــــ قرآن جیسے بلیغ اور حکیمانہ کلام میں حشو کیسا

جواب یہ ہے کہ حشو نہیں۔ مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ قتل انبیاء بجائے

خود اور عنداللہ تو ہمیشہ ہی ناحق ہوگا، لیکن بدبخت قاتلوں نے جب اپنے

ہاتھ ان معصوموں کے خون سے رنگین کیے، وہ سب قتل ایسے تھے کہ

خود اُنھیں کے معیار سے، اُن کے معیار معدلت وضابطۂ قانون سے

بھی ناحق تھے۔ یہ قول بعض نکتہ سنج مفسرین اس نکتہ تک از خود پہنچ گئے

اور بغیر قدیم قوموں کی تاریخوں کا مطالعہ کیئے ہوئے لکھ گئے بِغَيْرِ الْحَقِّ

اے كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ هُمْ اَيْضًا بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ یعنی انصاف

خداوندی کے خلاف تو تھا ہی، عدالتوں کا جو ضابطہ اور فوجداری کا جو قانون

اُن کے ملک و قوم میں جاری تھا اس کے بھی خلاف تھا۔

مسیحؑ عدالت میں

قرآن نے یہ بات ضمناً اور محض ایک دوسرے بیان کی لپیٹ میں ساڑھے تیرہ سو برس قبل

کہہ ڈالی تھی۔ اب کچھ عرصہ ہوا، یورپ کے ماہرین قانون نے قدیم نوشتوں

کی مدد سے، حضرت مسیحؑ کے مقدمہ کی روئداد از سرِ نو مرتب کی ہے۔

اور ایک کتاب انگلستان کے بیرسٹر اینس Annes نامی نے Trail of Jesus Christ

کے نام سے، اور دوسری، اٹلی کے ایک ایڈوکیٹ روزیڈی Rosadi

نے Trail of Jesus کے عنوان سے شایع کی۔ دونوں کتابو

شراب معمول سے زیادہ پی لی، نشہ تیز ہوگیا۔ سامنے اسی ملکہ کی لڑکی، پہلے شوہر سے، ناز و ادا، حسن و جمال کی پتلی، رقص کو کھڑی ہوئی۔ مخمور بادشاہ بیخود ہو کر بولا "مانگ، کیا انعام مانگتی ہے۔ آدھی سلطنت دیدینے کو تیار ہوں"۔ لڑکی سکھائی پڑھائی ہوئی تھی۔ ماں کے اشارہ سے بولی "مجھے تو یحییٰ کا سر چاندی کے طشت میں چاہیئے"۔ بادشاہ کا نشہ ہرن ہوا۔ بولا "ارے آج جشن مسرت کے دن اپنا ہاتھ خون سے رنگوں؟" رقاصہ نے ضد میں آکر کہا "لونگی تو وہی سر لونگی"۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ اور دم کے دم میں خدا کے اس نبی اور قوم اسرائیل کے تقریباً آخری پیمبر کا سر مبارک، جیل سے کٹا ہوا، اور چاندی کے طشت میں لگا ہوا، آگیا۔ ملاحظہ ہو انجیل مرقس، باب ۶ کی آیات ۱۶ تا ۲۸۔ اور انجیل متی کے باب ۱۴ کی آیات ۳ تا ۱۱ میں مشہور و قدیم یہودی مورخ جوزیفس کی تاریخ "آثار قدیمہ یہود Antiqui-ties of the Jews کے باب ۱۸ کی فصل پنجم، اور جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۷، صد ۲۸۹

خونِ ناحق۔ ابھی گزر چکا ہے کہ قرآن نے اسرائیلیوں کے ہاتھوں انبیاء کے قتل ناحق کا ذکر کیا ہے۔ قتل تو خیر، لیکن اس کے ساتھ یہ "ناحق" (بِغَیْرِ الْحَقِّ) کی قید کیسی؟ قتل انبیاء تو ظاہر ہے کہ جب کبھی بھی ہوگا، ناحق ہی ہوگا، حق یہ ہو ہی کب سکتا ہے۔

انسان کے قالب میں اور یسوع نام رکھ کر ظاہر ہوا۔ اس نے اپنے کو نوع انسانی کے کفارہ کے طور پر پیش کر دیا۔ اس نے انسانی قاعدہ کے مطابق سولی پر چڑھ کر جان دی۔ اور وہ تیسرے روز زندہ ہو کر آسمان پر چلا گیا ـــــ گویا حضرت کے نفس موت پر غالی دشمن اور غالی دوست دونوں متفق ہیں۔ اور اب ایک عرصہ سے قادیان کا جدید فرقہ بھی انھیں کا ہمنوا ہو گیا ہے۔

قرآن نے بے جگری کے ساتھ یہود و نصاریٰ دونوں کے مسلمات کو چیلنج دیدیا اور علانیہ کہدیا وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کہ یہود نے آپ ؑ کو نہ تو قتل کیا، اور نہ سولی ہی پر چڑھایا، بلکہ خود ہی دھوکے میں پڑ گئے، انھیں پر حقیقت مشتبہ ہو گئی! دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے، کہ دشمنوں نے آپ ؑ کی جان لینا چاہی، بلکہ اپنے خیال میں لے ڈالی بھی، لیکن حقیقۃً ایسا نہیں ہوا، دشمن خود وہم والتباس کا شکار ہو گئے ـــــ ایسی صورت ممکن کیونکر ہوئی؟ تاریخی قرائن، قیاسات شواہد اپنا فیصلہ کیا سناتے ہیں؟

حضرت مسیح ؑ کا زمانہ، قبل تاریخ کا نہیں، تاریخ کا زمانہ ہے۔ آپ کا ملک، آپ ہی کے ہم قوم یہود یا اسرائیلیوں کا ملک تھا، جیسے ہندوستان ہندوستانیوں کا ہے۔ یہ صوبہ یہودیہ Judea ارض شام کا علاقہ تھا۔

کے مطالعہ سے صاف نظر آجاتا ہے کہ حضرت ؑ کے مقدمہ میں یہ نہیں ہوا کہ رومی حاکم عدالت سے کوئی اجتہادی غلطی سرزد ہوگئی۔ بلکہ ہوا یہ کہ یہود نے ایک جھوٹا استغاثہ گڑھا۔ اور پہلے اپنی مذہبی عدالت میں بے ضابطہ کارروائیاں کرکرکے اور پھر ملک کی فوجداری عدالت میں رومی حاکم پر طرح طرح کے زور دباؤ ڈال ڈال کر سولی کا حکم دلانے میں کامیاب ہوگئے! ——— یہ اندھیر جب رومیوں کے روشن اور تاریخی عہد حکومت میں، رومی جیسی آئین دوست و قانون سرشت حکومت کی عدالت میں ممکن رہا، تو قدیم تر انبیاء کی مظلومیت، اور اُس عہد قبل تاریخ کی تاریکیوں اور ضابطہ شکنیوں کا کیا ٹھکانا! اَب جاکر قدر ہوئی قرآن کے اِس چھوٹے سے دو لفظی فقرہ بِغَيْرِ الْحَقِّ کی!

انجام مسیح ؑ حضرت مسیح ؑ کے مقدمہ تک تو آپ پہنچ ہی گئے۔ اَب ایک نظر دنیا میں اُن کے انجام پر بھی کرتے چلئے۔ یہود کا دعویٰ ہے کہ ہمارے درمیان یسوع ناصری نامے (نعوذ باللہ) ایک شعبدہ باز اور مفسدہ پرداز، انبیائے سابق اور شریعت موسوی کی توہین کرنے والا، پیدا ہوا تھا، سو ہم نے اُس کا کام تمام کر دیا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ خدا دُنیا کے گنہگاروں پر رحم کرنا چاہتا تھا، لیکن سب کو یک لخت معاف کر دینا اس کے قانون عدل کے منافی تھا، اِس لیئے وہ خود یا اُس کا اِکلوتا بیٹا،

بھی آپ ہی گئے۔ بلکہ تومی شبہات سب اِس کے برعکس ہیں۔
زمان ومکان کی تعیین ہو چکی۔ اب صورتِ حال کو پوری طرح پر سمجھنے کے
لیئے ماحول کے خصوصیاتِ ذیل کو نگاہ میں رکھیئے۔
پہلی بات تو یہ ہے کہ ملک میں آبادی یہود کی تھی، اور پولیس، عدالت
فوج رومیوں کی۔ رومی مشرک بت پرست تھے؛ یہود توحید و نبوت کے قائل
رومیوں کی زبان لاطینی تھی، یہود کی بول چال کی زبان سُریانی تھی اور کتابی
زبان عبرانی۔ رومی یوروپی نسل کے تھے، اور یہود سیماطیقی یا سامی نسل کے
غرض یہ کہ مذہب، زبان، لباس، وضع، تمدن، معاشرت، صورت،
ہر چیز میں یہود رومیوں سے ایسے ہی الگ اور ممتاز تھے جیسے ہندوستانی
انگریزوں سے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ قدرۃً یہ تھا کہ ایک رومی کے پہچاننے
میں یہود کو ایسی ہی دقت پیش آتی تھی، جیسے ہندوستانیوں کو گوروں کے
پہچاننے میں، اور گوروں کو کالوں ———— کے شناخت کرنے
میں۔ ہندیوں کی نظر میں سب فرنگی یکساں، فرنگیوں کی نظر میں سب ہندی
ہم شکل اسی طرح رومیوں کی نظر میں کل یہود یکساں دکھائی دیتے تھے۔
اور یہ معلوم ہے کہ رومی عدالت کے سپاہی، پیادے، پولیس گارڈ،
اور رومی جیل کے برقنداز (وارڈر) سب رومی ہی تھے اُن سے یہ توقع
رکھنا بیجا تھی کہ وہ کسی معمولی مجرم کی خاص طور پر شناخت رکھیں گے۔ اور

اِس پر حکومت اعلیٰ یہود کی نہیں، بلکہ اپنے زمانہ کی مشہور و مہذب رومی قوم کی تھی۔ جیسے ہندوستان پر آج حکومت برطانوی قوم کی ہے۔ اور یہودیہ اسی طرح ایک حصّہ رومن ایمپائر کا تھا، جیسے آج ہندوستان ایک حصہ برٹش ایمپائر کا ہے۔ لیکن اِس اقتدار اعلیٰ کے ماتحت نیم سیاسی آزادی اور مذہبی حیثیت سے تقریباً پوری آزادی یہودیہ کو حاصل تھی تقریباً ایسی ہی جیسے آج برطانیہ کے زیر سیادت مصر کو حاصل ہے۔ یہودیہ کا نیم خود مختار فرماں روا اُس وقت مشہور زبردست جابر ہیرودؔ تھا۔ حضرت یحییٰؑ کا سر چند سال قبل اُسی کے حکم سے قلم ہو چکا تھا۔ ملک کی فوجداری اور دیوانی عدالتیں، نیز فوج اور پولیس کے محکمے رومی حکومت کے ماتحت تھے۔ یہودی رعایا کے مقدمے پہلے خود آبائے یہود و مشایخ بنی اسرائیل کی مذہبی عدالتوں میں پیش ہوتے تھے فیصلے وہیں سے صادر ہوتے تھے۔ لیکن جرم اگر فوجداری کا ہوتا، تو سزا کے نفاذ کے لیئے مقدمہ دوبارہ ملکی عدالت میں پیش ہوتا، اور فیصلہ نافذ وہیں کا ہوتا۔ سنہ غالباً ۲۹ سنہ مسیحی تھا، جب مشایخ یہود کے حکم سے یسوع ناصری نامے "مجرم" کی گرفتاری عمل میں آئی۔ روایات سب اِس پر متفق ہیں کہ آپؑ کو پہلے یہود کی مذہبی عدالت سے سزا "ارتداد" کے جرم میں، موت کی ملی۔ اور پھر ملکی عدالت میں رومی حاکم نے بھی بغاوت کی دفعہ میں حکم سولی کا دیا۔ لیکن اُس کے آگے یہ امر محقق و مسلّم نہیں، کہ سولی پر چڑھائے

چلا گیا؟ (لوقا ۴: ۲۸-۳۰)

خاص یروشلم میں بھی ایک بار یہود نے مشتعل ہو کر آپ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی، اور ناکام رہے۔

"انھوں نے پھر اس کے پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ
اُن کے ہاتھ سے نکل گیا" (یوحنا ۱۰: ۳۹)

اسی انجیل میں ایک دوسرے موقع کا بیان سنئیے:۔

"یسوع نے اُن سے کہا، میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں
پیشتر اس سے کہ ابراہیم پیدا ہوا، میں ہوں۔ پس اُنھوں نے
اس کے مارنے کو پتھر اٹھائے۔ مگر یسوع چھپ کر ہیکل
سے نکل گیا۔ (یوحنا ۸: ۵۹)

یہ سب منظر تو دشمنوں کے مقابلہ میں پیش آئے۔ کبھی کبھی مریدوں اور معتقدوں کے سامنے بھی آپ کی ہیئت بدل جاتی ہے۔

"یسوع نے پطرس اور یعقوب اور یوحنا کو ہمراہ لیا
اور انھیں الگ ایک اونچے پہاڑ پر اکیلے میں لے گیا۔
اور اُن کے سامنے اس کی صورت بدل گئی"

(مرقس ۹، ۹: ۲)

انجیل لوقا میں ہے:۔

حضرت مسیحؑ بیغمبر خدا یا "ابن اللہ" کی اہمیت اب دنیا کی نظر میں جو کچھ بھی ہو، اُس وقت رومی حاکم اور رومی سپاہیوں کی نگاہ میں یسوعِ ناصری نامے ایک شخص کی حیثیت بجز بغاوت کے ایک عام و معمولی مجرم کے اور کیا تھی ؟ تھوڑی بہت جو کچھ بھی مخالفانہ حیثیت سے تھی، وہ یہود کی نظر میں تھی۔ رومیوں کی نگاہ میں تو اِتنی بھی نہ تھی۔

اِن عام حالات کے ساتھ یہ خاص حقیقت بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ حضرتؑ کو لوگوں کی نظر بلکہ اپنے ہی ہم قوم دشمنوں اور مخالفوں کی نظر بچا کر نکل جانے میں خاص کمال تھا۔ مسیحی اسے آپ کے معجزات میں شمار کرتے ہیں، یہود اسے (نعوذ باللہ) آپ کی شعبدہ بازی پر محمول کرتے ہیں۔ بہرحال نفس واقعہ سب کو تسلیم ہے۔ (ممکن ہے اِس کا ایک سبب آپ کی گوشہ گیری اور خلقت سے کم آمیزی بھی ہو) اناجیل میں آپ کی اِس خصوصیت کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ ناصرہ میں ایک وعظ کے بعد کا منظر، حسب روایت لوقا، ذرا غور سے ملاحظہ ہو:-

"جتنے عبادت خانے کے اندر تھے اِن باتوں کے سنتے ہی غصہ میں بھر گئے۔ اور اُٹھ کر اُس کو شہر سے باہر نکالا، اور اُس پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے جس پر اُن کا شہر آباد تھا، تاکہ اُسے سر کے بل گرا دیں۔ مگر وہ اُن کے بیچ سے نکل کر

مرقس کی روایت بھی تقریباً بالکل اُنھیں الفاظ میں ہے۔

اِن سب باتوں کو ذہن میں رکھ کر ایک کڑی یہ ملایئے کہ رومیوں کا جو سولی گھر تھا، وہ عدالت سے اچھے خاصے فاصلے پر تھا۔ انجیلوں میں اس مقام کا نام لاطینی تلفظ کے مطابق کیلوری Calvary اور عبرانی تلفظ کے لحاظ سے Golgtaha گلگتا آتا ہے، اور اُردو میں اِس کا ترجمہ کھوپری یا کھوپڑی کی جگہ کیا گیا ہے۔ اِس جگہ کا تعین صحت کے ساتھ تو دشوار ہے، تاہم اس پر سب کا اِتفاق ہے کہ وہ مقام تھا شہر سے دور۔ شہر پناہ کے باہر۔ انجیل ہی کے ایک صحیفہ "عبرانیوں کے نام کا خط" میں ہے۔ (۱۳ : ۱۲) کہ یسوع نے بھی اُمت کو اپنے خون سے پاک کرنے کے لیے "دروازہ کے باہر[1]" دُکھ اُٹھایا۔ غرض عدالت سے وہاں تک فاصلہ حضرت مسیحؑ کو رومی پولیس گارڈ کی نگرانی میں پیدل طے کرنا تھا۔ اور اِتنا ہی نہیں سولی کی ایک وزنی لکڑی آپ کو خود اُٹھا کر لے چلنی تھی۔ صلیب یا سولی کی شکل تو آپ کے ذہن میں ہوئے ہی گی + ایک ستون تو زمین میں گڑا ہوا ہوتا تھا۔ باقی دوسری لکڑی جو اُس کے اوپر آڑی جمائی جاتی تھی۔ اور اُسی پر مجرم کے دونوں ہاتھ پھیلا کر کس دیئے جاتے تھے اور اُن میں کیلیں ٹھونک دی

[1] بعض نسخوں میں ہے کہ "پھاٹک کے باہر ہو کر"

"جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اُس کے چہرہ کی صورت بدل گئی، اور اُس کی پوشاک سفید براق ہو گئی۔

(لوقا۔ ۹: ۲۹)

اور انجیل متی میں ہے:-

"ان کے سامنے اُس کی صورت بدل گئی، اور اُس کا چہرہ سورج کے مانند چمکا اور اُس کی پوشاک نور کے مانند سفید ہو گئی۔" (متی۔ ۱۷: ۲)

آخری بات اس سلسلہ کی یہ ہے کہ جب واقعتہً آپ کی گرفتاری گستمنے کے باغ میں ہوئی ہے، تو اگرچہ گرفتار کرنے والے پوری بھیڑ کی بھیڑ تھے، تاہم اس بھیڑ کو بھی اطمینان نہ تھا کہ آپ کو پہچان سکے گی۔ چنانچہ شناخت کے لئے آپ کے بارہ حواریوں میں سے، ایک غدار حواری یہوداہ نامے کو توڑ لیا

اس جزو پر ساری انجیلیں متفق ہیں۔ متی میں ہے:-

" یہوداہ جو اُن بارہ میں سے ایک تھا آیا۔ اور اُس کے ساتھ ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لیئے ہوئے سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے آ پہنچی اور اس کے پکڑوانے والے تھے اُنھیں یہ بتا دیا کہ جس کا میں بوسہ لوں، وہی ہے۔ اُسے پکڑ لینا۔" (متی۔ ۲۶: ۴۷و۴۸)

ہونے والی تھی۔ اور مزید یہ کہ کل صبح عید یہود تھی[1] شام اگر کہیں راہ ہی میں ہو گئی تو پھر کچھ کارروائی نہ ہوسکے گی۔

اَب صورتِ حال کو ایک بار پھر نظر کے سامنے لایئے۔ حضرت مسیحؑ لاغر و ناتوان، قاعدۂ مقررہ کے مطابق پُشت مبارک پر بوجھل صلیب کو اُٹھا کر سولی گھر روانہ ہوئے ہیں۔ وقت کم، فاصلہ زیادہ۔ ساتھ میں رومی سپاہی تو دہی گنتی کے چند تھے، البتہ خود حضرتؑ ہی کے ہم قوم، ہم وضع، ہم لباس یہود، انبوہ در انبوہ ساتھ تھے، آپؑ کو ستاتے ہوئے، چھیڑتے ہوئے آپ پر آوازے کستے ہوئے۔ صورتِ حال کا یہ نقشہ ذہن کے سامنے لاکر اپنے ہی سے سوال کیجئے کہ اَب کیا ہوا ہوگا؟ رومی سپاہی اپنی قومی برتری کے نشہ میں مست، خود تو یہ کرنے سے رہے، کہ اپنی رعایا اور پھر مجرم رعایا کے اُٹھانے والا بوجھ خود اپنے سر یا پُشت پر لادلیں۔ پھر ہجوم کی کثرت سے تنگ الگ ہو رہے تھے، اور دیر خواہ مخواہ ہو رہی تھی۔ قدرۃً یہی کیا ہوگا کہ اسی ہجوم میں سے کسی شخص کو پکڑ، اور عجب نہیں کہ کچھ ڈانٹ ڈپٹ کر کے، صلیب اُسی پر لاد دی ہو۔ اور یہ شخص یقیناً ایسا ہوگا، جو حضرت کے قریب آکر بار بار چھیڑ چھاڑ کر رہا ہو اور کچھ ہم شکل بھی ہو تو بعید نہیں بلکہ یا ہوگا"

[1] اِس جشن کا اصطلاحی نام Passover یا عیدِ فسح ہے۔

جاتی تھیں۔ وہ وہاں لگی ہوئی نہیں ہوتی تھی بلکہ عدالت میں رہا کرتی تھی، اور حکم سزائے موت سُننے کے بعد اُسے مجرم کو اپنی پیٹھ پر لاد کر سولی گھر تک چلنا پڑتا تھا۔

اُسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ ہونے دیجئیے کہ حکومت کو آپؑ سے مطلق پرخاش نہ تھی، بلکہ حاکم عدالت تو آپ کو بے قصور پاکر چھوڑ دینے ہی پر تلا ہوا تھا، اور آپ کو سزا جو دی وہ محض یہود کے بلوہ کے خوف سے۔

انجیل متی میں ہے:۔

"جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا۔ بلکہ اُلٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا میں اِس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب دے کر کہا کہ اِس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔"

(متی۔ ۲۷: ۲۴ و ۲۵)

غرض یہ کہ حکومت کی طرف سے آپ کی کسی خاص نگرانی کا کوئی محل نہ تھا، اور نہ حکومت کو اس کی کوئی خاص فکر تھی کہ آپ بچ کر نکلنے نہ پائیں۔ اور ہاں یہ ضروری جزئیہ بھی یاد رہے کہ جب حکم سنایا گیا ہے، تو جمعہ کا دن تھا اور سہ پہر کا وقت۔ یعنی سبت (یہود کے مقدس دن، سنیچر کی) شب عنقریب شروع

رومی سپاہی اپنا بیگار اُن پر ٹال، جیل والوں کا کام خود جیل والوں پر ڈال، معاً رخصت ہو گئے، اُنھیں کیا پڑی تھی کہ شناخت و تحقیق کی مزید زحمت میں اپنے کو مبتلا رکھتے۔ شام ہو ہی رہی تھی جیل کے سنتریوں نے جھٹ پٹ اسی کو سولی پر چڑھا دیا —— یسوع ناصری یوں بھی دشمنوں کے پنجے سے بار بار نکل چکے تھے، اور اب کی تو تائیدی اسباب بھی اس کثرت سے اُن کے حق میں جمع ہو گئے تھے —— غرض وہ پکڑا دھکڑا یہودی سولی پر چڑھا دیا گیا۔ وہ چیخا چلّایا، جیل کے رومی افسر اور سنتری اس کی زبان سے ناواقف، قدرۃً یہی سمجھے کہ مجرم کے آخری وقت کا جزع و فزع ہے۔ اور پھر ہزاروں کے ہجوم و ہنگامہ میں اس کی آواز خود یہود میں سے کتنوں کے کان میں پڑی ہوگی اور کتنوں نے اِدھر توجہ کی ہوگی! یہود دھوکے میں پڑے رہ گئے! وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ حقیقتِ حال اُن پر مشتبہ ہو کر طلسم بن کر رہ گئی!

قدیم نصرانیوں کی گواہی

گمان نہ گزرے کہ خیال تمامتر نیا، اور نظریہ یکسر نو آفریدہ ہے۔ مسیحیوں کے نہیں، نصرانیوں کے قدیم فرقوں میں ایک فرقہ Basilias (بسیلیہ) کا گزرا ہے، کوئی دوسری صدی مسیحی کے شروع میں (اس کے بانی کا زمانہ تقریباً ۱۲۵ء مانا گیا ہے) اُن کے ہاں۔ اِس عقیدہ کی

نہیں، واقعتہً ایک شخص کو پکڑ، صلیب اُس پر لاد دی۔ انجیل متی میں ہے:۔

"اُنھیں شمعون نامے ایک کرینی آدمی ملا۔ اُسے بیگار میں پکڑا کہ اُس کی صلیب اُٹھائے۔" (متی۔ ۲۷: ۳۲)

انگریزی میں اِسی شمعون کرینی کو Simon the Cyrenion کہتے ہیں۔ دوسری روایت مرقس کی سنیئے:۔

"اور شمعون نام ایک کرینی آدمی سکندر اور روفس کا باپ دیہات سے آتے ہوئے اُدھر سے گزرا۔ اُنھوں نے اسے بیگار میں پکڑا کہ اُس کی صلیب اُٹھائے۔" (مرقس۔ ۱۵: ۲۱)

لوقا کا بیان اور زیادہ صریح ہے:۔

"اور جب اُس کو لیے جاتے تھے تو اُنھوں نے شمعون نام ایک کرینی جو دیہات سے آتا تھا، پکڑ کے صلیب اُس پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے لے چلے۔" (لوقا۔ ۲۳: ۲۶)

روایتیں بیان ہو چکیں۔ اب ایک بار پھر چشم تصور سے کام لیجیئے۔ مجرم کا یہ ہم قوم وہم وضع صلیب پیٹھ پر لادے سولی گھر کے دروازہ پر پہنچا۔ پہرہ بدلا گیا۔ اب چارج جیل کے رومی سنتریوں اور پہرہ داروں کا شروع ہوا۔ وہ یقیناً اُسی کو مجرم سمجھے اور نہ سمجھنے کی وجہ کیا تھی۔ صلیب کی لکڑی اُسی کی پیٹھ پر لدی ہوئی تھی۔ ہمیشہ سے اِسی علامت کے عادی تھے۔ عدالت کے

ہندوستان سے اُنھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ حضرت یونسؑ نینوا والوں کے لئے تھے، چین سے اُنھیں علاقہ نہ تھا۔ حضرت مسیحؑ کا حلقۂ اصلاح یہود تک محدود تھا، چین اور پارسی، بودھ اور ہندو مذہب اُن کے قلمرو سے باہر تھے، اسلام نے پیمبرِ عرب اور رہبرِ عالم کے پیکر میں آکر اس قاعدۂ عام کو توڑ دیا۔ اور قرآن نے آکر صاف صاف دعوی کر دیا کہ میرا پیام کل دُنیا کے انسانیت کے لیئے ہے، میری مخاطب ساری نسلِ آدم ہے لیکن اسلام تو خود مدعی انبیاءِ قدیم کی سُنت پر چلنے اور قایم رہنے کا ہے، پھر اس اہم ترین باب میں، خود دائرۂ دعوت کے باب میں، یہ جدّت، یہ ندّرت، یہ "بدعت" کیسی؟ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس کی بھی دعوت مخصوص رہتی، اہلِ حجاز یا زدہ سے زیادہ اہلِ عرب کے ساتھ، اور اس کا پیام محدود رہتا نسلِ اسمٰعیل کے لیئے!

مسئلہ کے سمجھنے کے لیئے ایک اجمالی نظر دنیائے قدیم کے نقشہ پر کر جائیے۔ ہر ملک دوسرے ملک سے کٹا ہوا، ہر قوم دوسری قوم سے بچھڑی ہوئی۔ ہر سرزمین اپنے مخصوص جغرافی و طبعی حدود کے اندر سمٹی ہوئی، سکڑی ہوئی۔ پہاڑ ہیں تو ناقابلِ گزر، دریا ہیں تو ناقابلِ عبور، ندی نالوں کو پار کرنا دشوار، بلکہ برسات کے موسم میں تو کہنا چاہیئے کہ محال، اور بحر، بحیرہ یا سمندر کا تو خیر نام ہی نہ لیجیئے، کوئی ایسا ہی شدید سبب

تصریح موجود تھی کہ مصلوب حضرت مسیح ؑ نہیں ہوئے بلکہ شمعون کرینی!
(ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۳ صـ۱۷) ۔ اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں ایک قدیم فرقہ کا عقیدہ یہ لکھا چلا آرہا ہے کہ

"غلطی سے مصلوب شمعون کرینی ہوگیا۔ اور حضرت مسیح ؑ اُس کی شکل اختیار کیئے ہوئے پاس ہی کھڑے ہوئے ہنستے رہے۔" (جلد ۴۔ صـ۸۳۲)

آج کی مسیحیت کی ساری زندگی ہی حضرت مسیح ؑ کی مصلوبیت اور صلیب پر وفات اور دوبارہ جی اُٹھنے کے عقیدہ سے وابستہ ہے۔ لیکن قدیم نصرانیت، ابتدائی صدیوں والی، صاف لفظوں میں قائل تھی، وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی!

عالمگیر دعوت قرآن بیان کرتا ہے اور تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اسلام سے قبل جتنے بھی پیمبر آئے، سب اپنی یا دوسری کسی ایک ہی قوم کی جانب، اپنے یا دوسرے کسی ایک ہی ملک کے لیئے۔ بائبل میں بھی ذکر صرف اسرائیلی انبیاء کا آتا ہے جو قوم اسرائیل کے لیئے آئے، یا پھر اُن چند انبیاء کا جو اس قوم کے اسلاف اور مورثوں یا عزیزوں میں تھے۔ حضرت ہود ؑ صرف قوم عاد کے لیئے تھے۔

کسی عالمگیر پیام نبوت کے اِمکانات ہی اُس وقت کیا تھے؟ عالمگیر نہ سہی ایک براعظم کو بھی دوسرے براعظم سے ملانے والی، جوڑنے والی اُس وقت کونسی راہیں، سڑکیں تھیں؟ براعظم کو بھی چھوڑیئے، ہندوستان، چین، روس جیسے لق و دق کسی ایک ہی ملک کے ایک گوشہ کو دوسرے گوشہ سے جوڑے رکھنے کی صورت تھی؟ —— اُس وقت تو حالات تکوینی کے لحاظ سے عین تقاضا تھا حکمتِ تشریعی کا، کہ پیام اور پیامبری کو محدود رکھا جاتا چھوٹے چھوٹے خطوں، مختصر علاقوں کے اندر، اور یہی ہوا لیکن رفتہ رفتہ اِسی دُنیا کے موسم نے پلٹا کھایا۔ مشینی دَور کا آغاز ہوا۔ اور اُس نے گویا ملکوں اور اِقلیموں کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں۔ فاصلہ کا لفظ اب بے معنیٰ ہو گیا، اور کوئی مقام، پرانے معیار سے، اب کہنا چاہیئے کہ کہیں سے دُور نہیں رہا۔ پہلے باقاعدہ سڑکیں بننا شروع ہوئیں، تیز رفتار گھوڑوں، سانڈنیوں کی نسلیں پرورش پانے لگیں۔ ڈاک اور ہرکارے کے تصور سے دماغ آشنا ہونے لگے۔ نئی نئی سواریاں، بگھیوں، ٹمٹموں، شکرم گاڑیوں کے نام سے وجود میں آنے لگیں۔ پھر اِس خشک زمین پر ریل کی پٹریاں بچھنے لگیں۔ پہلے دُخانی اور پھر برقی قوتوں کے قابو میں آجانے سے ریل، لاری، ٹریم، موٹر سائیکل، خدا جانے کتنی اور کیسی کیسی صبا رفتار سواریاں وجود میں آگئیں۔ اُدھر ڈونگیا کشتیوں نے پہلے بادبانی اور پھر

دشمنی کا، اور قوی محرک فوج کشی کا پیدا ہوگیا، جب تو مجبوری ہے، ورنہ ہر خطۂ زمین کی جو قدرتی چار دیواری بن گئی، بس وہ قوم اُسی کے اندر محصور اور گویا نظر بند۔[1] مسافروں کا آنا جانا تو الگ رہا، باہر سے خبروں کے آنے کا انتظام نہیں، اور ڈاک کا موجودہ مفہوم تو گویا کسی کے ذہن ہی میں نہیں مہینوں میں کوئی باہمت قافلہ، برسوں میں کوئی جیوٹ والا سیاح آنکلتا، تو ایک نعمت ہاتھ آجاتی، اور تھوڑی بہت خبریں آس پاس کے ملکوں کی معلوم ہوجاتیں۔ مشرق و مغرب کا فاصلہ رکھنے والے دور دراز ملک تو اِتنے سہارے سے بھی محروم! خود ایک ہی ذرا بڑے ملک کے اندر ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا، وہاں کی خبریں لانا، وہاں اپنا پیام پہنچانا کام تھا صرف ہمت وروں کا، نصیبہ والوں کا! اور تو اور کسی باقاعدہ سڑک کا وجود بھی سنہ ۳۰۰ ق.م. سے قبل کم از کم یورپ میں تو نہیں ملتا۔

اِس صورت حال کو وضاحت کے ساتھ ذہن میں لاکر سوال یہ کیجئے

[1] بلکہ اُس وقت کی بعض ترقی یافتہ قوموں نے تو اس علیحدگی اور کنارہ کشی میں غلو و مبالغہ سے کام لے کر اپنے افراد کے لئے باہر کا سمندری سفر حرام کر دیا تھا: مثلاً اہل ہند نے۔

اور پیمبری دعوت کی مخاطب اَب نہ قومِ عرب ہو نہ قومِ عجم، نہ بنی اِسرائیل نہ بنی اسمٰعیل یا کہ ساری نسلِ آدم ہو! قدرت کے اِنتظامات گرمی کے زمانے میں کچھ اور ہوتے ہیں سردی کے وقت کچھ اور۔ بہار کی رُت میں کچھ اور، خزاں کی فصل میں کچھ اور۔ نظامِ تکوینی کا دروبست، موسم کی ہر گردش کے ساتھ آفتاب یا زمین کے ہر چکر کے ساتھ خود بھی بدلتا رہتا ہے ——— عالَم اور اہلِ عالَم کے ماحول کے اِتنے بڑے عظیم الشان اِنقلاب کے بعد لازمی تھا کہ طریقِ پیام و پیامبری بدلے۔ اور تشریعی دعوت اِس تکوینی نظامِ نو سے مطابقت اِختیار کرے! گویا وہی قانونِ حکمت جس کا تقاضا مدتِ دراز تک، ہزارہا سال تک یہ رہا کہ نبوت، نسلی، قومی، ملکی ہوا کرے، ٹھیک اُسی قانونِ حکمت کے ماتحت یہ لازمی ہوگیا کہ اَب جو پیمبری ہو، عالمگیر ہو۔ اور اَب جو کتاب اور پیام آئے، وہ نوعِ اِنسان کے کسی جزو کے لیئے نہیں نوعِ اِنسان کے لیئے ہوا۔

لیکن قدرت کے نظامِ تکوینی کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ اصل ضرورت کے پیش آنے اور محسوس ہونے سے قبل ہی اس کے متعلق اِنتظامات ہر طرح کے ہو جاتے ہیں۔ پیاسا اِنسان بعد کو پیدا ہوا، بہتے ہوئے دریا، اُبلتے ہوئے چشمے اُس کی پیاس بجھانے کو مدتوں قبل سے وجود میں آ چکے تھے۔ دیکھنے والی آنکھ بعد کو کھلی، روشنی پیدا کرنے والی، روشنی پھیلانے والی کرنیں بہت قبل سے اَندھیرے کو اُجالا بنائے ہوئے تھیں، دوڑنے کی مشق اِنسانی

دُخانی جہازوں کی شکلیں اختیار کرنا شروع کیں۔ اور بڑے بڑے عظیم الشان جہاز سمندر کا جگر چیر چیر کر رکھنے لگے۔ مشرق کے میوے مغرب میں ڈھیر ہونے لگے، اور شمال کے سودے جنوب میں بکنے لگے۔ ڈاک نے سینکڑوں میل پر رہنے والوں کی خیریت دنوں بلکہ گھنٹوں میں سنا دی۔ تار نے ہزاروں میل کی خبر منٹوں میں منگا دی۔ ٹیلیفون نے جنوب کے ڈانڈے شمال سے ملا دیئے، اور ریڈیو نے مشرق کی آواز مغرب میں پہنچا دی۔ غرض اب ہر ملک کھنچ کر دوسرے سے اتنا قریب آگیا کہ گویا ایک بڑے شہر کے دو محلے ہیں۔ دُنیا کا رقبہ گویا سمٹ گیا۔ کرہ کا قطر گویا سکڑ گیا۔ پریس کی ایجاد نے کتابوں، رسالوں، اخباروں کی بھرمار نے، سینما کی گرم بازاری نے، ریڈیو کی محفل آرائی نے، ایک نئی قسم کی وحدت میں گوروں اور کالوں کو، زنگیوں اور فرنگیوں کو، حبشیوں اور تاتاریوں کو جکڑ دیا۔ جو بچھڑے ہوئے تھے، مل گئے۔ جو بکھرے ہوئے تھے جڑ گئے۔ ایک نئی قسم کی یکرنگی کی لہر یہاں سے وہاں تک دوڑ گئی۔ انسانیت کی مستقل تقسیم اب ملکوں اور قوموں کی ٹکڑیوں، ٹولیوں میں نہیں رہی، نسل انسانی ایک ہی قبیلہ، ایک ہی خاندان بن گئی، مختلف محلوں میں آباد!

حکمت کاملہ کا عین تقاضا اس دور کے لیئے اب یہی ٹھہرا کہ پیام مختلف قوموں، قبیلوں کے بجائے، اب صرف ایک آئے، سارے عالم انسانی کیلئے

ہر عرض البلد کے لیئے یہ قایم رہے گا قیامت تک، اور اُسی چشمۂ ہدایت سے استفادہ کرتے رہیں گے، غلام و آزاد، شہری و دیہاتی، مشرقی اور مغربی، گورے اور کالے ! —— الیوم والی آیت بڑے دعویٰ کا اعلان ہے انسان کی بنیادی وحدت کا اعلان ہے اور اُس وقت جبکہ یہ حقیقت مخفی تھی وقت کے بڑے بڑے مفکروں، فلسفیوں، حکیموں، سب کی نظر سے۔ قرآن والوں کو اس سے جھجکنا نہیں، اس پر فخر کرنا چاہیئے۔ اور داد دینی چاہیئے اُس یہودی کی حقیقت سنجی کی، جو آیت کو سن کر بول اٹھا تھا کہ کہیں ہماری کتاب میں ایسی آیت نازل ہوئی ہوتی تو ہم تو اُس دن کو یوم عید، یوم جشن بنا لیتے!

سمت پرستی شرک کی ایک مستقل قسم | سورۂ بقر کی آیت ۱۷۷ اور اُس کے رکوع ۲۲ کی پہلی آیت کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ الخ	نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے چہروں کو پھیر لو (نماز کے وقت) مشرق اور مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر۔ وغیرہا۔

سیاق نماز اور استقبال قبلہ کا ہے۔ اب چونکہ ہر نماز پڑھنے والا نماز پڑھتے

ٹانگوں نے بہت بعد کو کی، پیشوائی کے لئے کھلے ہوئے میدان مدتوں قبل سے حاضر تھے۔ انسان کے پتلے کے لئے مٹی کا خمیر بھی ابھی تیار نہیں ہوا تھا کہ سورج اور چاند، ہوا اور ستارے، دریا اور پہاڑ، چرند و پرند سب اُس کی خدمت کے لئے مستعد اور کمربستہ، خلعتِ وجود سے مشرف، خدا معلوم کتنی صدیوں اور کتنے قرنوں قبل سے ہو چکے تھے!

مخلوق کی ضرورتوں کا اندازہ داں خالق سے بڑھ کر، اور مظاہر فطرت کے لیے وقت و ساعت کا مصلحت شناس فاطرِ کائنات سے زیادہ اور کون ہوسکتا ہے؟ ریل اور تار کی ایجادیں ابھی صدیوں کا عرصہ باقی تھا، ٹیلیفون اور ریڈیو کے خوابوں سے بھی ابھی بشر کا دماغ بیگانہ تھا، چین اور عرب ابھی اپنے درمیان بُعد المشرقین ہی سمجھ رہے تھے کہ ندا کرنے والے نے بے دھڑک پکار دیا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ وقت آگیا اے آدم کے فرزند و خدائی پروگرام میں، کہ تمھیں ایک کامل و مکمل دین، ہر ضرورت کے لیے کافی اور ہر ماحول کے مطابق، دیدیا جائے، چنانچہ دیا جا رہا ہے اور تم سب کے ہاتھ میں بلا امتیاز رنگ و نسل، بلا تفریق حال و مستقبل، ایک نظام نامہ پہنچایا جا رہا ہے، زندگی کے ہر شعبہ، ہر پہلو سے متعلق، جامع مکمل، ہمہ گیر اور ناقابل نسخ و تبدیل ماہر آب و ہوا کے لیئے، ہر طول البلد کے لیئے

اور قبلہ رُخ ہونا نمازمیں فرض عین ہے، اِس لیئے ذہن میں استقبال قبلہ اور استقبال سمت کا مفہوم ایک قرار دیا گیا، اور قبلہ رُخی مرادف ٹھہر گئی، سمت رخی کے! حالانکہ دونوں چیزیں بالکل الگ، اور ایک کا مفہوم دوسرے سے بالکل جُدا ہے۔ قرآن یہاں جس چیز کے عبادت ہونے، نیکی سمجھے جانے کی نفی کامل کر رہا ہے ——— الفاظ یاد رکھیئے، لَيْسَ الْبِرَّ۔ نیکی یہ ذرا سی بھی نہیں ——— وہ "سمت رُخی" ہے، اور جس چیز کو اُس نے واجب قرار دیا ہے وہ "قبلہ رُخی" ہے۔ اور بچہ بچہ جانتا ہے کہ قبلہ یا کعبہ کسی سمت کا نام نہیں: ——— سمتیں تو معلوم و معروف کُل ہی چار ہیں، مشرق، مغرب شمال، جنوب، اور یا پھر اُنھیں کے مُرکبات، مثلاً شمال و مشرق، جنوب و مغرب وغیرہ۔ کیا قرآن نے اُن میں سے کسی مفرد یا مرکب سمت کو قبلہ قرار دیا ہے؟ اُن میں سے کسی جانب رُخ کرنے کا حکم دیا ہے؟ نہیں، بلکہ بدیہی تو یہ امر ہے کہ ہر نمازی سمت سے بالکل بے پروا ہو کر اپنا رُخ ایک متعین مقام، ایک متعین مکان، ایک متعین عمارت، کعبہ نامے کی جانب کیئے ہوئے رہے! یمن والوں کو شمال کی جانب اور شام والوں کو جنوب کی جانب سجدہ کرتے کس نے نہیں دیکھا؟

قرآن نے قبلہ تو صرف ایک متعین عمارت کو مقرر کیا ہے، اور وہ جہاں سے جس جانب بھی پڑے۔ اور یہی واقعہ ہے کہ وہ کہیں سے شمال یا

وقت بہر حال کسی نہ کسی سمت ہی اپنا رُخ رکھتا ہے، بلکہ متعین طور پر یوں کہیئے کہ نجد، عراق، ایران، افغانستان، بلوچستان، ہندوستان، برما، تبت، چین، وغیرہ کے نمازیوں کے مُنھ تو ہمیشہ مغرب کی جانب رہتے ہیں، اور مصر، طرابلس، حبشہ، مراقش وغیرہ کے نمازیوں کے مُنہ ہمیشہ مشرق کی جانب۔ اِس لیئے قدرۃً اہل تفسیر کو یہ الجھن پیش آئی، کہ قرآن ایسی بدیہی چیز سے اِنکار کیسے کر رہا ہے؟ اور یہ اِعلان کس طرح کر رہا ہے کہ نیکی یا عبادت یہ ہی نہیں کہ نماز میں رُخ فلاں فلاں سمت کیا جائے، درآنحالیکہ مشاہدہ ہے کہ ہر نمازی اپنا رُخ کسی نہ کسی سمت کی جانب رکھتا ہی ہے!

اِسی دشواری سے بچنے کے لیئے کسی نے یہ کیا کہ بِرّ کو کمال پر محمول اور نیکی کو کمال نیکی کے ساتھ مقیّد کر دیا۔ یعنی اصل عبادت، یا کمال عبادت، یا مغز عبادت یہ نہیں کہ مُنہ فلاں فلاں سمت کیا جائے، بلکہ اصل عبادت تو یہ ہے کہ عقائد درست کیئے جائیں، اللہ اور فرشتوں پر ایمان رکھا جائے وَقِسْ عَلٰی ھٰذَا۔ اور کسی نے مُراد لی، کہ نیکی صرف یہی نہیں کہ منہ فلاں سمت رکھا جائے، بلکہ مقدم چیز یہ ہے کہ عقاید کو دُرست کیا جائے، وغیرہا۔

——— لیکن قرآن کی اصل عبارت بالکل بے غبار اور اُن تکلفات وتاویلات کے بغیر بھی بالکل صاف اور بے داغ ہے۔

مغالطۂ ذہنی کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ نمازی کسی نہ کسی رُخ کھڑا ہوتا ہی ہے

کوئی دخل سمت وتعین سمت کے باب میں نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ شرک کی جو بیشمار قسمیں دنیا میں رائج رہ چکی ہیں، اور اب تک ہیں، فرزندانِ توحید کو نہ اُن کا احساس ہے نہ اندازہ۔ قرآن اپنے بلیغ انداز میں تردید اُن میں سے ایک ایک خفی سی خفی صورت کی بھی کرتا گیا ہے۔ مفسر غریب، کیسا ہی صاحب تحقیق ہو، بعض دفعہ دنگ وحیران رہ جاتا ہے کہ یہ تیر آخر کس نشانہ پر لگایا جا رہا ہے۔ شرک کی انھیں غیر معروف لیکن نہایت وسیع صورتوں میں ایک صورت کا نام سمت پرستی یا Direction worship کی ہے۔ یعنی کوئی ایک سمت (زیادہ تر سمتِ مشرق) مقدس فرض کر لی گئی اور پوجا اسی سمت کی شروع ہو گئی، اور غضب یہ ہوا کہ بعض آسمانی مذاہب بھی جب رفتہ رفتہ شرک کے شکار ہونے لگے، تو یہ سمت پرستی والا شرک بھی اُن کے عقاید کا جزو بن گیا۔ قرآن کی ہمہ بین، ہمہ گیر نظر، ہر مفسر وشارح کی گرفت سے بالاتر، اِس دقیقہ پر بھی پہونچی، اور اُس نے صاف اعلان کر دیا کہ تم جو مشرق پرستی اور مغرب پرستی میں پڑے ہو۔ یہ مشرق پرستی اور مغرب روئی اپنے اندر ذرہ بھر بھی عملِ خیر نہیں رکھتی، لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ یہ ہرگز اعمالِ خیر میں سے نہیں، دینِ صحیح سے اسے مطلق سروکار نہیں۔

مشرق پرستی ومغرب پرستی | مسیحی مذہب سے قدیم تر، یونان کا قدیم

پڑتا ہے، کہیں سے جنوب میں، کہیں سے مشرق میں، کہیں سے مغرب میں کہیں سے شمال و مشرق کے گوشہ میں، کہیں سے جنوب و مغرب کے زاویہ میں! ——— وہی مسافر جس نے عصر کی نماز شمال کے رُخ پر پڑھی تھی، ریل یا جہاز کے مڑ جانے سے مغرب کی نماز مشرق کی جانب پڑھے گا، اور عشاء کی نماز سواری کا رُخ ایک بار پھر تبدیل ہو جانے کی بناء پر پھر شمال ہی کی طرف! تیز رفتار سواریوں میں تو بارہا اتفاق یہ ہوا ہے کہ نماز شروع کی ہے فلاں رُخ کی جانب، لیکن ابھی پہلی رکعت بھی نہیں تمام ہونے پائی ہے کہ سواری کا رُخ بدل گیا ہے، اور اب نمازی بھی اپنا رُخ دوسری طرف پھیر رہا ہے! تو مشاہد کسی سمت کی جانب رُخ کرنا نہ ہوا۔ مشاہد تو اُس کے برعکس یہ ہے کہ نمازی رُخ کسی بھی متعین سمت کی جانب نہیں کرتا۔

اِس مقالہ کے سامعین (اور اس کے چھپ جانے پر اس کے ناظرین) میں سے اکثر نمازی ہوں گے۔ نماز کی نیت باندھتے وقت آپ کو خیال پورب پچھم، وغیرہ، کسی سمت کا بھی آتا ہے؟ یا جیسا آپ زبان سے کہتے جاتے ہیں، "منہ میرا طرف کعبہ شریف کے" خیال و التفات کعبہ ہی کا رہتا ہے! ارادہ تو آپ کا یقیناً صرف کعبہ کی جانب توجہ کا رہتا ہے۔ اور یہ محض تکوینی اتفاق ہے کہ کعبہ کبھی آپ سے مشرق میں پڑ جاتا ہے، کبھی مغرب میں، کبھی اِس سمت، کبھی اُس سمت، آپ کے قصد ارادہ و نیت کو ہرگز

موجود ہیں۔

بعض مشرک قوموں نے ایک فلسفہ یہ گڑھا۔ کہ جس طرح آفتاب مظہر ہے حیات کا، اور دیوتا ہے آفرینش کا، اِسی طرح رات کی تاریکی دیوتا ہے موت کا، اور مظہر ہے ہلاکت کا۔ اِس لیئے غروب آفتاب کی سمت، یعنی مغرب، مسکن ہے موت و ہلاکت کے دیوتا کا، اور اِس لیئے مقدس سمت مشرق نہیں، بلکہ مغرب ہے۔ ٹایلر کی مشہور و ضخیم کتاب "ابتدائی تہذیب Primitive Culture" اور فن کی دوسری کتابوں میں تصریحات موجود ملیں گی ——— غرض یہ کہ دنیا میں مشرق پرستی خوب زوروں کے ساتھ رہ چکی ہے، اور اس کے بعد مغرب پرستی بھی۔ اور اس کے بہت بعد کسی نہ کسی درجہ میں دوسری سمتوں کا تقدس بھی۔

قرآن نے ضرب اِسی عقیدۂ سمت پرستی پر لگائی، اور یونانی حکماء، رومی فلاسفہ، مسیحی فضلاء، سب کے مقابلہ میں اعلان کیا، کہ سمت کوئی بھی مقدس نہیں، سمت پرستی سراسر خرافات پر مبنی ہے۔ سمتیں سمتیں سب برابر۔ تمھیں جو حکم دیا جا رہا ہے، وہ تو صرف ایک مرکز کی جانب متوجہ ہونے کا ہے کہ اس سے قوم میں یکجہتی، مرکزیت پیدا ہوگی۔ اور اُسی کا نام استقبال قبلہ ہے، خواہ وہ قبلہ نمازی کے جس سمت بھی واقع ہو! ——— یہیں سے بعض دوسری آیتیں بھی صاف ہوئی جاتی ہیں، مثلاً لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ یا فَاَیْنَمَا تُوَلُّوا

مذہب ہوا ہے، اور مسیحی مذہب اپنی موجودہ ہیئت میں بڑی حد تک اِس کا خوشہ
چین بھی ہے۔ اِس یونانی مذہب میں دیوتا یا معبود دو طرح کے ہوتے تھے،
ایک قسم کے اولمپیائی Olympian gods کہلاتے تھے۔ اُن کا مسکن
سمت مشرق تھا۔ اور اِسی لئے خود یہ سمت مقدس ہو گئی تھی۔ اِن دیوتاؤں
کے مندر مشرق رویہ ہوتے تھے۔ اور اہل یونان اپنی پوجا پاٹ اِسی رُخ
ہو کر کرتے تھے۔ دیوتاؤں ہی کی دوسری قسم، کیتھولک Catholic gods
کہلاتی تھی۔ یہ دیوتا، پہلی قسم کے برعکس، سمت مغرب میں رہتے تھے۔ اور اُن کے
پجاریوں کے عقیدہ میں تقدس سمتِ مغرب میں سمٹ آیا تھا۔ اور انسائیکلوپیڈیا
آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (جلد ۲ اص ۶۱۵) کے ایک حوالے سے معلوم ہوتا ہے
کہ قدیم ہند و مذہب میں شرف تقدس سمت جنوب و مشرق کو حاصل ہے۔ آفتاب
پرست قومیں جتنی بھی گزری ہیں سب نے مقدس سمت مشرق کو مانا ہے۔

موجودہ مسیحیت جو بڑی حد تک معجون مرکب ہے یونانی شرک اور رومی شرک کا،
اس نے یہ جہت مشرق کا تقدس بھی اپنے اندر انھیں یونانیوں اور رومیوں
سے لے کر حلول کر لیا ہے چنانچہ Drientation مشرق رُخی، مسیحیوں
کے ہاں کی مخصوص مذہبی اِصطلاح ہے، اُن کے گرجے اِسی رُخ پر تعمیر ہوتے
ہیں۔ شامی عیسائی اور فرقہ ایسین والے Essenes اپنی نمازیں
اسی رُخ پر ادا کرتے ہیں۔ اِنسائیکلوپیڈیا برٹانیکا وغیرہ میں اس پر مفصل معلومات

ہونا تو کجا، دوسروں کا حاجت روا ہونا تو الگ رہا، جہت مشرق و جہت مغرب خود اپنی جگہ پر بھی تو آزاد، مطلق العنان، خود مختار نہیں۔ اللہ کے مخلوق ہیں، مغلوب ہیں، محکوم ہیں۔ اپنے وجود میں اُس کے محتاج، اپنی بقا میں اس کے محتاج اپنے قیام میں اُسی کے قاعدوں، ضابطوں کے تابع! ——— نام اُنھیں دو سمتوں کا صراحت کے ساتھ اس لیے لیا گیا کہ یہی دو سمتیں سب سے زیادہ شرک پرور رہی ہیں، مشرکانہ عقاید کی سب بڑی اُمید گاہیں رہی ہیں:

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ

عقیدۂ تجسیم پر ضرب ——— اے خدائے واحد کے پرستار اور شرک و شبہۂ شرک سے بیزار، مسلمانو! کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا بھی پابند ہے کسی سمت کا مقید ہے کسی جہت کے ساتھ۔ تم جدھر بھی اپنا منہ کرو، نماز، دعا، عبادت کے لیے، بس خدا اُسی طرف ہے۔ وہ پاک ہے ہر سمت سے، منزہ ہے ہر جہت سے۔ اس کی ذاتِ پاک کے تجلّیات ہر طرف ہیں، سب کہیں ہیں، جدھر بھی رُخ کرو، جلوہ اُسی کا پاؤ گے۔ کون سی جہت، کون سا مکان، کون سا گوشہ اِس سے خالی ہے؟ ——— یہ سب تردید ہو رہی ہے عقیدۂ تجسیم Anthropomorphism کی۔ وہی عقیدۂ تجسیم، جو جزو لاینفک رہا ہے نہ صرف وحشی قوموں کے مذہبوں کا، بلکہ جہاں تک پتہ چلتا ہے انگریزی لکھے ہوئے

فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ یعنی سمتیں، جہتیں، سب اللہ ہی کی مخلوق و مِلک ہیں۔
کسی میں نہ کوئی الوہیت ہے نہ تقدس۔ اللہ نہ پابند ہے کسی جہت کا نہ محدود ہے
کسی سمت کے ساتھ، تم رُخ جدھر بھی کر دگے، اللہ ہی کا نور ظہور پاؤ گے،
باقی ایک خاص عمارت، ایک مخصوص مکان کو جو مرکز توجہ قرار دیا جا رہا ہے،
وہ امت میں، ملت میں، یکجہتی اور دوسرے مصالح سے ہے۔ اور سمت
پرستی کو تقویت پہنچانے والا نہیں، اُس پر ضرب کاری لگانے والا ہے۔

وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ ہی کے ہیں
مشرق اور مغرب۔ لیکن اللہ کے نہیں، تو اور کس کے ہوتے؟ اتنی کھلی ہوئی
اور صاف حقیقت کو اتنی صراحت سے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

ضرورت تھی۔ صاف اور کھلی ہوئی حقیقت تو یہ اب قرآن کے نزول
کے بعد، اور قرآن کے ماننے والوں کو معلوم ہو رہی ہے۔ اِس سے پہلے یہ کھلی
ہوئی حقیقت تھی ہی کب؟ مصری، ہندی، رومی قوموں نے کہا کہ مشرق،
سورج دیوتا کے طلوع کی جگہ ہے، اس لیے یہ جہت خود بھی مقدس ہے۔ رومیوں
کی تقلید میں مسیحی بھی آفتاب پرستی کے دوسرے عنصر ان کی طرح مشرق کے
تقدس کے قائل ہو گئے، اور مشرق رُخی Drientation وغیرہ
مسئلے اپنے ہاں گڑھ لیے۔ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ اِن سب کے
خلاف اعلان جہاد ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ان میں تقدس اور شان الوہیت

چل رہا ہے۔ آیت ۱۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے، وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ۔ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے بنا رکھا ہے ایک بیٹا۔ یہ کہنے والے اس قول کے قائل کون ہیں؟ وسیع معنیٰ میں بہت سے اہلِ باطل مراد ہو سکتے ہیں، کہ خداوند تعالیٰ کی فرزندی کا عقیدہ بہت سی قوموں میں عام و مشترک ہے۔ لیکن خصوصی معنیٰ میں مراد انھیں سے ہے جو اپنے کو مسیحی کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے "خدا کے ایک بیٹا ہے" نہیں الفاظِ قرآنی ہیں اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا، خدا نے بنا رکھا ہے ایک بیٹا ——— قرآن آخر خدا کا کلام ہے، عجیب مفسر، غریب شارح، ہر ہر اشارہ، ہر ہر تلمیح کو کہاں تک اپنے فہم و ادراک کی گرفت میں لاتا رہے! ——— مسیحیوں کا عام عقیدہ جو اس باب میں ہے، معلوم و معروف ہے۔ یعنی یہ کہ ایک خدا ہے، اور ایک خدا کا بیٹا ہے وہ بھی قدیم، یہ بھی قدیم۔ وہ بھی غیر مخلوق، یہ بھی غیر مخلوق۔ وہ بھی ازلی، یہ بھی ازلی۔ لیکن انھیں مشرک مسیحوں کے اندر، گو نسبتاً ان سے بلند تر، ایک فرقہ، قدیم و زبردست، مسیحوں کا ایسا بھی گزرا ہے، جو کہتے تھے، کہ عیسیٰ مسیح اصلاً خدا نہ تھے، اپنی سرشت کے لحاظ سے انسان ہی تھے، جیسے ہم آپ ہیں۔ البتہ روح القدس کی روحانیت کا فیضان ان پر شروع سے تھا۔ اور اس کی شدت اس درجہ ہوئی کہ وہ ہمہ تن تقدس کے رنگ میں ڈوب گئے۔ اور خدا نے جب ان میں خدائی رنگ اس نوبت پر پایا تو انھیں اپنا بیٹا بنا لیا۔

تذکرۃ الادیان سے، چینی مذہب کا، مصری مذہب کا، کلدانی مذہب کا، ہندی مذہب کا، یونانی مذہب کا، رومی مذہب کا، مسیحی مذہب کا، خصوصاً اس کی لاطینی شاخ کا، اور سب سے بڑھ کر حیرت یہ ہے کہ خود اسرائیلیوں کے بھی مذہبِ توحید کا!

آیت کے خاتمہ کے الفاظ ہیں، اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ اللہ تو خود ہی انتہائی وسعت رکھنے والا ہے، ہر شئے پر وسعت رکھنے والا ہے۔ ساری وسعتیں خود اُس کے اندر سمائی ہوئی ہیں، وہ کس وسعت کے اندر سما سکتا ہے؟ ساری سمتوں، جہتوں کو تو وہ خود ہی احاطہ میں لیئے ہوئے ہے، اُس کا احاطہ کون سمت، کون جہت کر سکتی ہے؟ وہ کس طرح کسی جہت سے مقید، کسی سمت سے محدود ہو سکتا ہے؟ ساتھ ہی وہ انتہائی علم والا بھی ہے کامل علم رکھنے والا ہے، مخلوق کی ہر ضرورت کا، کائنات کی ہر مصلحت کا، وہ اپنے اِس علم کامل کے لحاظ سے جس مکان کو چاہے قبلہ مقرر کر دے، جس عمارت کو چاہے مرکز توجہ ٹھہرا دے سارے عبادت گزاروں کا۔ اِس مرکزیت ویکسوئی کے تعین میں اصلاً دخل نہیں ہے کسی جہت کے تقدس کا، کسی سمت کے خدائی ہونے کا!

خدا کا متبنیٰ۔ آیت ۱۱۵ ختم ہوگئی سورۂ بقر کی یہ مسئلہ وہی صفاتِ خداوندی کا

ملکیّت کاملہ

سُبۡحٰنَهٗ مَعَاذَ اللہ سُبۡحٰنَهٗ! خدائے پاک پاک ہے اس قسم کی مادی قرابتوں، رشتہ داریوں سے، اُسے ایک طرف خدا بھی کہے جاتے ہو، اُس کی قدرت کا کلمہ بھی پڑھتے ہو، اور پھر محتاج سمجھتے ہو اُسے اس کا، کہ وہ دُنیا کے لاولد لوگوں، اور لاولدی کے نقصانات محسوس کرنے والے اِنسانوں کی طرح، کسی کو گود لے کر اپنی لاولدی کی تلافی کرے! یہ کیا لغو خیالی اور کیسی پریشان دماغی ہے۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِس کا تو سب ہی کچھ ہے، اعلیٰ وادنیٰ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے۔ صحیح رشتہ اُس کے اور اُس کی مخلوقات کے درمیان مِلک کا ہے، وہ سب کا مالک سب اُس کے مملوک۔ جس سے جو چاہے کام لے۔ اُسے ضرورت کیا کسی کو گود لینے، کسی کو بیٹا بنانے کی! مِلک کا تعلق تو فرزندی وتبنیت کے تعلق سے کہیں زیادہ قوی موجود ہے۔ آخر اُس کے لئے ممکن ہی کونسا ارمان ہے، کہ اُس کے پورا کرنے کے لیئے کسی کو متبنیٰ بنانے کی حاجت پیش آئے؟

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ۔ سب اُس کے آگے گردن جھکائے ہوئے ہیں بڑے سے بڑے گردن کش بھی اطاعتِ اِضطراری وطبعی پر مجبور، احکام شرعیّہ نہ سہی، قوانین تکوینی کی فرمانبرداری سے تو کسی کو بھی چارہ نہیں بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اور یہ ہیبتناک آسمان اور رتق ودق زمین، کہ بیسیوں قوموں کی پیشانیاں انھیں کے آگے زمین پر لگ گئیں، یہ نہ دیویاں ہیں نہ دیوتا

اپنی خدائی میں شریک کرلیا۔ اپنی تبنیت سے مشرف کردیا۔

انگریزی میں اصطلاحی نام اس عقیدہ کا Adoptianism ہے
اس کا ترجمہ "تبنیت" ہوسکتا ہے، اور اس فرقہ کو انگریزی میں Adoptioneit
کہتے ہیں۔ مسیحیت کی قدیم تاریخیں اس فرقہ کے تذکرہ سے لبریز ہیں۔ مسیحیت
کی ابتدائی صدیوں میں اس فرقہ کا خاصہ زور تھا۔ حال میں جرمن محقق ہارنک
Harnack نے اپنی "تاریخ العقیدہ" History of Dogma
میں تفصیل سے دکھایا ہے کہ ۱۸۵ئہ میں تھیوڈوٹس بازنطینی Ihesdotus
of Byzantive نے اس عقیدہ کو روم میں خاص طور پر چمکایا تھا۔ خود اس پر تو
۱۹۵ئہ میں حکم تکفیر لگ گیا لیکن اس کے شاگرد ارٹیمن Artéman نے
اس تعلیم کو جاری رکھا۔ اور مشرق میں بریلس بسطردی Brylles of Bostia
پولوس سموسطوی Paul of Samosata اس کے علمبردار ہوگئے۔ یہاں
تک کہ پادری ایریس Arius اور نسطوریس Nestorins
کے واسطہ سے عین ظہور اسلام تک اس کا دم خم قائم رہا۔ اور آٹھویں صدی
اور بارھویں صدی عیسوی میں پھر اس کا بار بار زور بندھا۔ شرک تثلیثی کی اور
صورتوں سے نسبتہً یہ صورت خفی ہے۔ قرآن نے اشارہ اسی فرقہ کے عقاید
کی جانب کیا۔ اور قرآن کی بلاغت معنوی کی داد دیجیے کہ ایک لفظ اتخاذ ولد
لاکر تاریخ مسیحیت کے کتنے اہم و وسیع باب کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔

اِس میں النَّبِیُّوْنَ کے ساتھ ٹکڑا جو اَلَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا کا لگا ہوا ہے اُس نے قدیم مفسرین کے لئے اچھی خاصی الجھن پیدا کر دی۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ "ہم نے توریت نازل کی۔ اُس کے اندر ہدایت اور نور ہے۔ اُسی کے مطابق وہ نبی جو اللہ کے مطیع تھے، یہودیوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے" ـــــــ جو نبی اللہ کے مُطیع تھے، کیا معنی؟ کیا کوئی نبی ایسے بھی ہوئے ہیں، جو اللہ کے مُطیع نہ ہوں؟ فرماں بردار رہونے کی جگہ نافرمان ہوں؟

اِشکال اِس بناء پر ہوا کہ ذہن کے سامنے تصور اِس نبوت کا رہا۔ جو ایک اِسلامی اِصطلاح بن چکی ہے اور اُس میں نبوت کے معنی لازمی طور پر نبوت الٰہی ہی کے ہیں۔ لیکن صاحب قرآن کو تو بہرحال معلوم تھا کہ یہود کے ہاں نبوت کا تخیل یہ نہیں رہا ہے۔ اُن کے سارے مذہبی ادب میں نبی کا لفظ اپنے لغوی معنی میں اِستعمال ہوا ہے۔ یعنی خبر دینے والا، پیشگوئی کرنے والا، عام اُس سے کہ اُس کا تعلق خدا سے ہو یا شیطان سے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ صاحبِ کشف ہو۔ مشرک قوموں میں جو مرتبہ کاہن کا ہوتا ہے بس اُسی سے ملتا جلتا منصب یہود کے ہاں نبی کا ہوتا ہے۔ صرف اُس میں اِشراقیت ہونا ضروری تھی جو بعض کو طبعاً و جبلۃً حاصل ہوتی ہے، اور بعض کو مشق و ریاضت سے حاصل ہو جاتی ہے۔ صداقت، حقانیت، روحانیت تعلق باللہ، ملکۂ اِصلاح خلق و تزکیۂ نفس سے اِس کا بہرہ مند ہونا ہرگز ضروری

نہ صاحبِ اختیار و صاحبِ تصرف۔ یہ تو خود مخلوق و مجبور، بے کس و بے اختیار ہیں اللہ موجد ہے ان سب کا۔ لفظ بدیع خیال میں رہے۔ وہ انھیں نیست سے ہست کرنے والا ہے۔ عدم محض سے وجود میں لانے والا ہے۔ بغیر کسی آلہ کی مدد کے، بغیر کسی سابق الوجود مادہ کے۔ بغیر کسی سابق الوجود نمونہ کے! وہ محض صانع یا کاریگر نہیں، کہ ایک نمونہ کو دیکھکر اس کی نقل اصل سے ملادی۔ کوئی مادہ پہلے سے موجود تھا اسے اپنی ترتیب اور ترکیب سے ایک خاص صورت دیدی! ——— اس ایک لفظ میں رد آگیا ان سارے مشرکانہ مذہبوں کا، جو خدا کو محض ایک صنّاع یا کاریگر کا درجہ دیتے ہیں۔ اور تردید ہوگئی ان سارے مشرک فلسفیوں کی جو ایک طرف خدا کو خدا بھی مانے جاتے ہیں، اور دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ روح کو قدیم، اور مادہ کو غیر حادث قرار دیئے جاتے ہیں۔ قرآن کے اس قسم کے چھوٹے چھوٹے فقروں، مفرد لفظوں کی پوری قدر جبھی ہوتی ہے، جب دنیا کی باطل پرستیوں کی مثالیں اور نمونے تفصیل کے ساتھ نظر کے سامنے ہوں!

نبی کا مفہوم دورِ قبل اسلام میں۔ | سورۂ مائدہ میں ایک جگہ آتا ہے اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا

تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خدا کی کہی ہوئی نہیں
تو جان رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے، اور وہ جو اس نے
کہا ہے واقع نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی، بلکہ اس نبی نے
گستاخی سے کہی ہے، تو اُس سے مت ڈر" (۱۸: ۲۰-۲۲)

تیسرا اقتباس اِس حقیقت کو پوری طرح واضح کیئے دیتا ہے کہ بنی اسرائیل میں نبوت بالکل کہانت کی قسم کی ایک چیز ہو گئی تھی، اور انبیا اور کاہنوں کا درجہ ایک ہو گیا تھا یرمیاہ نبی اپنی سرگزشت کا ایک حصہ یوں سناتے ہیں:-

"تب میں نے کہا ہائے اے خداوند یہوواہ! کچھ انبیا ان
سے کہتے ہیں کہ تم تلوار نہ دیکھو گے، اور تم پر کال نہ آئے گا بلکہ
میں اس مکان میں تم کو ایسی سلامتی دوں گا جو قایم رہیگی تب
خداوند نے کہا کہ انبیاء میرا نام لے کر جھوٹی نبوت کرتے ہیں،
میں نے انھیں نہیں بھیجا اور حکم نہیں دیا نہ انھیں کہا۔ وہ جھوٹی
رویا اور جھوٹا علم غیب اور بے اصل باتیں اور اپنے دلوں کی
مکاریاں نبوت کی طرح تم پر ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیئے خداوند
یوں کہتا ہے ان نبیوں کی بابت جو میرا نام لے کے نبوت کرتے
ہیں جنھیں میں نے نہیں بھیجا اور جو کہتے ہیں کہ تلوار اور کال
سے ہلاک کیئے جائیں گے۔ اور جن لوگوں سے وہ نبوت کرتے

نہ تھا چنانچہ توریت میں ایک جگہ اور ضمناً و اجمالاً نہیں، متعدد جگہ اور صراحۃً، تفصیلاً ذِکر ایسے نبیوں کا مِلتا ہے، جو کفر کی دعوت دینے والے اور شرک کی طرف بُلانے والے تھے۔

توریت کی کتاب اِستثنار میں ہے:۔

"اگر تمھارے درمیان کوئی نبی یا خواب دیکھنے والا ظاہر ہو اور تمھیں کوئی نشان یا معجزہ دِکھلا دے اور اُس نشان یا معجزہ کے مطابق جو اُس نے تمھیں دکھایا یا بات واقع ہو اور وہ تمھیں کہے آؤ ہم غیر معبودوں کی جنھیں تم نے نہیں جا پیروی کریں اور اُن کی بندگی کریں، تو ہرگز اُس نبی یا خواب دیکھنے والے کی بات پر کان مت دھرو۔ . . . . اور وہ نبی یا خواب دیکھنے والا قتل کیا جائے گا" (۱۳: ۱ - ۵)

اِس میں صریحاً دعوتِ شرک و ضلالت دینے والے کو نبی سے تعبیر کیا گیا ہے، اور ایسے نبی کو واجب القتل قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا اِقتباس اِسی کتاب اِستثنار کا اور ملاحظہ ہو:۔

"لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے کہ جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا، یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ اور اگر

کرتے ہیں۔ اور اُنھوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اَے اِسرائیل
تیرے نبی اُن لومڑیوں کی مانند ہیں، جو اُجاڑ مکانوں میں
رہتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دھوکا اور جھوٹا شگون دیکھ کے کہتے
ہیں کہ خداوند کہتا ہے اگرچہ خداوند نے اُنھیں نہیں بھیجا ہے
اور اوروں بنی اُمید پیدا کرتے کہ سخن پورا ہو جائیگا۔ کیا تم نے
باطل رویا نہیں دیکھی۔ کیا تم نے جھوٹی غیب دانی نہیں کی
اور بولتے ہو کہ خداوند نے کہا ہے، اگرچہ میں نے نہیں کہا۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میرا ہاتھ اُن نبیوں پر جو دھوکا دیتے ہیں اور
جھوٹی غیب دانی کرتے ہیں ” (خرقی ایل ۔ ۱۳ : ۱ - ۹)

یہ چند اقتباسات صرف نمونہ کے طور پر دیدیئے گئے۔ ورنہ اور بھی بہت سے اسی مفہوم و مضمون کے توریت میں مل جاتے ہیں۔ اور جعلی نبی کی سزا بھی شریعت یہود میں یہ ہے کہ اُسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا جائے (جیوش انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ۱۰۔ صد ۲۱۲ ک ۱)

تاریخ بنی اسرائیل میں ایک ایسا دور بھی گزرا ہے کہ بنی کے بجائے۔ ”غیب بین“ کی اصطلاح رائج تھی توریت میں اس کی تصریح موجود ہے:۔

” اگلے زمانے میں بنی اسرائیل کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی
خدا سے مصلحت کرنے جاتا تھا تو کہتا تھا کہ آؤ ہم غیب بین

سو وہ کال اور تلوار کے سبب سے یروسلم کے کوچوں میں پھینک
دیئے جائیں گے اور اُن کی جورواں اور اُن کے بیٹے اور بیٹیاں
اور اُن کا گاڑنے والا کوئی نہ ہوگا کہ اُن کی بُرائی اُن پر ڈالوں گا"

(یرمیاہ - ۱۴ : ۱۳ - ۱۶)

کاہنوں ہی کی طرح یہ جھوٹے نبی بھی عذاب الٰہی کے مستحق اِسی دُنیا میں ہوا کرتے
تھے ۔ اِسی کتاب یرمیاہ میں ہے :-

" خداوند یوں کہتا ہے دیکھو میں اس سرزمین کے سارے
رہنے والوں کو، ہاں اُن بادشاہوں کو جو داؤد کے تخت پر بیٹھے
اور کاہنوں اور نبیوں اور یروسلم کے سارے باشندوں کو مستی
سے لبالب کرونگا ۔ اور میں اُن میں سے ایک دوسرے پر یعنی
اور باپوں کو ایک ساتھ ڈال دوں گا" (۱۳ : ۱۳ و ۱۴)

حزقی ایل نبی کی کتاب میں بھی اِس قسم کے بنے ہوئے نبیوں اور اُنکی بیہودگیوں
اور سزاؤں کا ذکر ہے :-

" اے آدم زاد اسرائیل کے بیٹوں سے جو نبوت کرتے ہیں
اُن کا مخالف ہو کر نبوت کر، اور اُن سے جو اپنے اپنے دل سے
نبوت کرتے ہیں اُن سے کہہ کہ خدا کا کلام سنو ۔ خداوند یہوواہ یوں
کہتا ہے کہ بیہودہ نبیوں پر واویلا ہے جو اپنی ہی روح کی پیروی

مقالۂ دوّم

جدید قصص الانبیاء

کے پاس جائیں۔ اس لیئے کہ جو اب نبی کہلاتا ہے آگے غیب بین کہلاتا تھا" (۱۔سموئیل۔ ۹۰۹)

قرآن مجید نے انبیاء اسرائیل کے ساتھ اَلَّذِیۡنَ اَسۡلَمُوۡا کی قید لگا کر اسرائیلی نبوت کی تاریخ کے دریا کو گویا کوزہ میں بند کر دیا، تفسیر کی ساری الجھنیں دور کر دیں۔ اور اشارہ کر دیا کہ یہاں مراد سچے اور صحیح انبیاء ہیں۔ اسلامی اصطلاح والے انبیاء ہیں غیب بین اور کاہن اور اسرائیلی اصطلاح والے انبیاء مُراد نہیں۔

حضرات صحبت بہت طویل ہو گئی، آپ کب تک سُنتے جائیں گے یہ چند قدیم مسائل جدید روشنی میں محض نمونہ کے طور پر پیش کئے گئے۔ ابھی قرآنی مسائل بیسیوں نہیں، بلکہ پچاسوں شاید سینکڑوں کی تعداد میں ایسے اور ہیں کہ اُن پر علوم جدید، اور تحقیق مزید کی روشنی اور پڑے تو مضمحل و مجروح ہونے کے بجائے وہ اور زیادہ نکھر آئیں گے۔ اُن کے جوہر اور زیادہ چمک اُٹھیں گے۔

مقالۂ دوّم

ابوالبشر آدمؑ

دنیا بن کر تیار ہو چکی، زمین کا فرش اپنی رنگینیوں اور بوقلمونیوں کے ساتھ بچھ چکا ہے۔ آسمان کی چھت اپنی بلندیوں کے ساتھ قایم ہو چکی ہے آفتاب اور ماہتاب کے ہنڈے روشن ہو چکے ہیں۔ تاروں کے قمقمے مدّت ہوئی کہ رات کے اندھیرے کو اُجالے میں تبدیل کر چکے ہیں۔ گھوڑے، ہاتھی، مچھلی، کچھوے، فاختہ، کبوتر، سارے جاندار زمین پر، سمندر میں، فضا میں، زندگی کی سانس لے رہے ہیں۔ دریا کی جگہ دریا موجوں کا لطف دکھا رہے ہیں۔ پہاڑ کی جگہ پہاڑ اپنی ہیبت دلوں میں بٹھا رہے ہیں۔ نور کے بنے ہوئے فرشتے، نار کے بنے ہوئے جنات، سب خلعت وجود سے مشرف ہو چکے ہیں۔ غرض مجلسِ کائنات ہر طرح آراستہ۔

انتظامات مکمل ہو چکے، تو اب حکمت کاملہ کو منظور ہوا کہ محفل میں قدم رونق محفل کے آئیں اور زمین پر نفاذ آسمان والے کے قانون کا شروع ہو قانون تکوینی (Physical Law) تو شروع ہی سے نافذ تھا۔ اب منظور

تم نے وہی کہا۔ جو تمہیں اپنی بصیرت کے مطابق نظر آیا، تمہیں کیا علم ہماری لامحدود حکمتوں کا، بے پایاں مصلحتوں کا، جو کام اس نئی مخلوق سے لیتے ہیں۔ اس کو قویٰ بھی تو ملیں گے اُنہیں کے مناسب انہیں کے متناسب۔"

خاموشی ملأ اعلیٰ پر چھاگئی۔ نار نور دونوں سے الگ، دونوں کے خواص ترکیبی سے جُدا، خاک کا ایک پُتلہ تیار ہوا۔ اور اس کے اندر روح الٰہی دم ہوئی۔ روح کا دم ہونا تھا کہ گیلی مٹی کا خمیر کیا ہوا اور اب خشک اور کھنکھناتا ہوا پُتلہ۔ دم کے دم میں جیتا جاگتا، دانا و بینا آدم بن گیا۔ سلسلۂ نسل انسانی کا مورث اعلیٰ، علوم و معارف سے لبریز، آخر خلیفۃ اللہ تھا نہ۔ میں کیا لفظ بول گیا؟ اصل قصّہ کا سررشتۂ بیان چھوڑ، چند لمحوں کے لئے ذرا اسی لفظ کو دُہرا لیجئے۔ اور اسی کی معنویت پر دھیان جما لیجئے۔ خلیفۃ اللہ۔" کہ یہی حیثیت تو آدم کی اصلی اور اہم ترین حیثیت تھی۔ قرآن مجید میں جہاں خلقت آدم کا بیان پہلی بار آیا ہے۔ یہ نہیں وارد ہوا ہے۔ کہ جب ہمیں نوع انسانی کی آفرینش منظور ہوئی۔ یا سلسلہ بشری کا پہلا انسان پیدا کرنا منظور ہوا، بلکہ ارشاد ہوا ہے

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً،

یعنی یاد کرو وہ وقت جب پروردگار نے فرشتوں سے کہا۔ کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ آدمؑ کو ابو البشر مسلمانوں کے علاوہ یہود اور مسیحیوں نے بھی مانا ہے۔ لیکن ملاحظہ ہو کہ بائبل میں یہ ذکر کس انداز سے، اور کس

ہوا کہ سکہ "قانون تشریعی (Moral Law) کا چلے۔ اضطراری تعمیل اوّل دن سے ہو رہی تھی۔ اب وقت اس کا آیا کہ تعمیل عقل و ارادہ کے ساتھ ہو، قصد و اختیار کے ساتھ ہو۔ مخلوقات کی صف میں سب سے معزّز سب سے مقرّب فرشتے تھے۔ ارشاد انہیں سے ہوا۔ کچھ خبر ہے؟ وجود میں ایک تازہ مخلوق آنے کو ہے۔ وہ روئے زمین پر ہمارا خلیفہ ہوگا۔ ہمارا قانون چلائے گا۔ فرشتے غیب دان نہ تھے لیکن بہرحال فہم و فراست کے تو حصہ دار تھے ہی۔ اور حاضر پر غایب کو قیاس کر ہی سکتے تھے۔ قوائے بشری کی ترکیب اور زمینی مخلوقات کی ضروریات و مقتضیات کا اندازہ لگا، دل میں سمجھے اور صحیح سمجھے۔ کہ اس نئی مخلوق کی ذرّیات میں کچھ سرکش و غدّار، عاصی و نافرمان ضرور ہی پیدا ہونگے۔ بولے، اور دفا سرشت بندوں کی طرح آقا پرستی کے جوش سے لبریز ہو کر بولے کہ "حضور والا! ہم خدّام قدیم آخر کس دن کے لئے ہیں؟ جو بھی خدمت ہو ہمارے جسم و جان اس کے لئے حاضر ہیں؟ یہ نئے حضرت جو آرہے ہیں۔ نفس اور ارادہ بھی تو ساتھ لا رہے ہیں۔ آپس میں لڑیں گے، بھڑینگے، جھگڑینگے اور ایک دوسرے کا سر اور سرکار کا قانون توڑیں گے، طبع مبارک کی گرانی کے سبب بنیں گے۔ یہ منظر ہم جان نثاروں سے کس دل سے دیکھا جائے گا؟"
جواب میں ارشاد ہوا کہ " تمہاری خیر خواہی مسلّم۔ لیکن تمہارا علم بہرحال محدود

پھر ایک اور گوشہ سے روشنی اس حقیقت پر ڈالئے۔ ایک اور زاویہ سے اسے جانچئے۔ ایک اور پیمانہ سے اِسے ناپیئے۔ آفرینش تو جس طرح آدمؑ کی ہوئی ہے۔ اسی طرح آخر ساری مخلوق کی ہوئی ہے۔ جمادات وحیوانات کی بھی ملائکہ اور جنّات کی بھی، عرش کی بھی، کرسی کی بھی لیکن اور کسی کے بھی ارادہ تخلیق کا ذکر قرآن نے اہتمام کے ساتھ کیا ہے؟ یہ فخر تو صرف خلقتِ آدم کے موضوع کو ملا۔ اور کیوں نہ ملتا؟ نایب السلطنت کا ورود، اور عوام النّاس کی نقل وحرکت کہیں ایک درجہ کی چیزیں ہیں؟ ــــــ اللہ اللہ! خاک کے پُتلے کا یہ شرف ومرتبہ! مذاہب شرکیہ کا تو خیر ذکر ہی کیا۔ انسان کے شرف واحترام کا یہ مقام، یہودیت نے کب جانا ہے؟ مسیحیت نے کب پہچانا ہے؟ اہل کتاب، کی کتاب کا حوالہ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

اچھا اب پھر آجایئے اصل قصّہ کی طرف۔ آدم (Viec gerent Designate) خلیفہ نامزد تیار ہو چکے۔ اب فرشتہ بلائے گئے۔ کہ وہی مخلوقات میں سب سے داناتر، عالم تر، کامل تر تھے۔ ارشاد ہوا کہ اچھا اشیائے کائنات کے خواص تو بیان کرو۔ نہ بیان کر سکے۔ کہ اس علم سے کورے تھے۔ اس علم سے کام اُنہیں پڑنے والا ہی نہ تھا ــــــ ذکر وشغل میں لگے رہنے والے صوفیوں اور زاہدوں کو حدیث کے نقد سے، رجال کی جرح سے۔ فقہ فتاویٰ سے، قانون کے احکام سے آخر واسطہ ہی کیا؟ ــــــ اشارہ

محل پر آتا ہے۔ اوپر سے ذکرِ آسمان و زمین اور جمادات و نباتات، حیوانات کی پیدائش کا چلا آتا ہے۔ کہ اسی لپیٹ میں یہ تذکرہ بھی آجاتا ہے۔

"خداوند خدا نے زمین پر پانی نہ برسایا تھا اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے۔ اور زمین سے بخار اٹھتا تھا اور تمام روئے زمین کو سیراب کرتا تھا۔ اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا، اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا۔ سو آدم جیتی جان ہوا"۔

(پیدائش - ۲: ۵ - ۷)

گویا جس طرح اور سب جانوروں کی نوعیں پیدا ہو رہی تھیں۔ ایک جاندار انسان نامی کی بھی نوع پیدا ہوگئی۔ اور اس سلسلہ کے بانی کا نام آدم رہا! اور گویا اس کا کام زیادہ سے زیادہ یہ تھا۔ کہ زمین کی کھیتی کرے! کہاں مادّیت، حیوانیت کی یہ پستی اور کہاں نصب العین کی یہ بلندی، کہ انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔ اسے اپنے اعمال کے لئے جواب دہ اپنے خالق کے روبرو ہونا ہے۔ پہلی بات تو لفظ خلیفہ کے تلفظ کے ساتھ ہی یہ سمجھ میں آئی۔ پھر اتنا ہی نہیں۔ وہ دوسروں کی بھی تکمیل کرے گا۔ اخلاقی، عقلی، روحانی اصلاح میں لگا رہے گا۔ اور روئے زمین پر معدلت اور سیاست کی شریعت کا سکّہ چلائے گا۔ یہ سارا مفہوم ذرا سے لفظ خلیفۃ اللہ کے اندر شامل!

میں ہے اِلیٰ یا سمت وجہت کے۔ سجدہ آدم کو نہیں۔ صرف سمت آدم میں تھا آج عالمِ اجسام میں، تکلیفاتِ شرعیہ کے پورے ظہور کے وقت بھی۔ سجدہ کعبہ کو نہیں ربِّ کعبہ کو کیا جاتا ہے۔ کعبہ صرف سمت ہے۔ کل اسی طرح عالمِ ارواح میں جب تکلیفاتِ شرعیہ کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ مسجود آدم نہیں، آدم آفرین ہی تھا۔ پیکرِ آدم صرف سمت سجدہ تھا۔

بہرحال حکم اظہارِ اطاعت کا فرشتوں کو مِلا۔ اور جب فرشتوں کو ملا، تو ظاہر ہے۔ کہ اُن سے ادنیٰ مخلوق کو پہلے ہی سے مل چکا۔ (اور یہ بات ایسی کھلی ہوئی، اور اتنی موٹی ہے کہ قرآن مجید نے اس کی صراحت ضروری نہ سمجھی) خیر۔ حکم کی تعمیل سب نے کی۔ ایک نہ کی۔ تو آگ کے بنے ہوئے ایک جن ابلیس نامے نے۔ انانیت کی آگ سے جل کر بولا "میں آتشی ہو کر خاکی کے آگے جھکوں؟ اونے کے آگے اعلیٰ اپنے کو جھکائے گرائے؟ ناممکن!" اپنی عقل پر نازاں، بے وقوف اتنا نہ سوچا۔ کہ خود اسی کی کیا دلیل ہے عقلی یا نقلی۔ کہ آگ ہرحال میں خاک سے افضل ہی ہے اور بالفرض ہو بھی۔ تو یہ کس قاعدہ سے ثابت ہے۔ کہ کسی خاص مصلحت سے کسی مخصوص حکمت کی بناء پر بھی بڑا چھوٹے کے آگے کسی حال میں نہ جھکے؟ غرض اس منطق ابلیسی کے صغریٰ وکبریٰ دونوں غلط۔ نکالا گیا ملاءِ اعلیٰ سے۔ پھینکا گیا آسمان سے۔ حکم کی نافرمانی کی علت میں، حکم بھی کس کا؟ حاکم برحق کا، حکیم مطلق کا!

آدمؑ کو ہوا۔ آپ نے سبق فرفر سنا دیا۔ تسبیح و تقدیس کرتی رہنے والی معصوم مخلوق بے اختیار نعرہ لگا اُٹھی۔

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْم

پاک ہیں آپ اے ہمارے سرکار پاک ہیں اس سے کہ آپ کا کوئی بھی فعل حکمت سے خالی ہو مصلحت سے عاری ہو ہمیں علم ہی کیا ہے؟ ہاں بس وہی تھوڑا بہت جو آپ ہی نے ہمیں عطا کر رکھا ہے ہمارے علم جزئی کو آپ کے علم کلی سے نسبت کیا؟ حقیقۃً علم والے تو آپ ہیں کہ آپ کے لئے حاضر و غائب، قریب و بعید، ماضی و مستقبل سب یکساں عالم کل آپ ہیں ہر مخلوق کے ظرف کے، استعداد کے، صلاحیت طبع کے! اور حکمت والے بھی آپ ہی۔ کہ بشر و ملک ہر مخلوق میں تقسیم علم اسی کے استعداد کے مطابق، اسی کے ظرف کے متناسب کر دی!

یہ منظر برخاست، اب پردہ دوسرے منظر سے اٹھتا ہے، آدمؑ کے سر پر اب خلافت الٰہی کا تاج ہے۔ حکم فرشتوں کو ملتا ہے کہ ہمارے اسی نائب کے آگے جھکو۔ نذرانہ عقیدت اس کے سامنے پیش کرو، اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ میں سجدہ اپنے لغوی معنی میں ہے۔ سجدای خضع نماز کا اصطلاحی سجدہ مراد نہیں نماز کے سجدہ کو بھی سجدہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ تذلل و تواضع کا بہترین مظہر ہے اور پھر اہل تحقیق کی یہ تصریح بھی موجود ہے۔ کہ لِاٰدَمَ میں صرف لام معنی

کیوں آنے لگا تو لیجئے میں قسم کھا کر کہتا ہوں اپنے اور آپ کے پروردگار کی۔ اور آپ تو عاشق ٹھہرے اُن کے نام کے۔

عاشق محبوب کا نام سُن کر پھسل پڑا۔ اس کا طائرِ فکر یہاں تک پہنچ ہی نہ سکا۔ کہ اُس کے محبوب کا نام کوئی بے وقعتی یا بے قدری کے ساتھ لے سکتا ہے حضرت آدم حریص تو تھے ہی دل و جان سے مقام قرب حق میں قیام کے۔ اِدھر ذہن ہی نہ گیا۔ کہ کہنے والا ہے کون؟ اور کس نیت سے یہ افسوں پھونک رہا ہے۔ بس اُس کے پھسلاوے میں آ پھل کھا بیٹھے پھل کا کھانا ہی تھا۔ کہ عمل کے طبعی اثرات ظاہر ہونے لگے۔ برہنگی اب تک چھپی ہوئی تھی۔ اب ظاہر ہوگئی۔ اور گزری جو کچھ گذری۔ اب احساس ہوا غلطی کا۔ اور دور شروع ہوا توبہ کا۔ ندامت کا۔ استغفار کا۔ اس پر قصور معاف ہوا۔ مرتبہ مقبولیت پر بحال ہوئے لیکن بہرحال طبعی اثرات، گناہ دُھل جانے کے بعد بھی قانون تکوینی کے ماتحت ظہور کر ہی دیتے ہیں۔ سنکھیا کھا کر توبہ و ندامت میں غرق ہو جانے سے خودکشی کا گناہ ممکن ہے معاف ہو جائے لیکن جسم پر موت کے مادّی اثرات تو طاری ہو کر ہی رہیں گے۔ جنّت کی آب و ہوا کے ناموافق اور وہاں کی فضا کے لئے غیر مناسب و غیر صالح غذا کھا کر وہاں مزید قیام کی گنجائش نہ تھی۔ حکم ہوا۔" میاں بیوی دونو زمین پر اُتر جاؤ۔ اب وہیں تمہاری نسل رہے بسے گی۔ ہر ایک کے لئے ایک مقدار کی عمر مقرر ہوگی۔ اس کے بعد ہماری

ابلیس نکلنے کو تو نکلا۔ لیکن اکڑ کے ساتھ۔ اکڑ وہی جس کا نام آج کی ادبی بولی میں "پندار تفوق" ہے۔ کہتا ہوا نکلا۔ کہ "میں تو جا رہا ہوں لیکن اپنے ساتھ اور بھی تیرے بہت سے بندوں کو لے مروں گا۔" ارشاد ہوا "چل دور ہو۔ جو تیری راہ چلنا چاہیں گے۔ وہ اپنا کیا ہوا خود ہی بھگتیں گے باقی جو لوگ اپنے ارادہ و اختیار سے صحیح کام لیتے رہیں گے۔ اور ہمارے نازل کئے ہوئے پیمبروں کی راہ پر قایم رہیں گے۔ اُن پر تیرا جادو کچھ بھی نہ چل سکے گا۔ تیرے پاس قوت ہی کون سی ہے بجز وسوسہ اندازی کے۔" ادہر یہ ہوا، اُدھر آدم مع اپنی صاحبہ حوّا کے مزے چین سے جنّت میں رہنے بسنے لگے۔ ممانعت صرف ایک خاص درخت کے پاس جانے کی تھی۔

دونوں غافل و بےخبر اسی عیش میں تھے۔ کہ موقع مل گیا ابلیس کو وار کرنے کا۔ ابلیس کا صفاتی نام اب شیطان تھا۔ پٹی ایک روز یہ پڑھائی کہ "مزے سے جائیے آئیے نہ اُس درخت کے پاس۔ وہ ممانعت جو ہوئی تھی۔ وہ تو عارضی تھی۔ اُس وقت آپ کے قویٰ میں پختگی نہیں آئی تھی۔ اب آپ ہر طرح پختہ ہو چکے۔ جائیے اور بے تکلّف کھائیے پھل اس درخت کے۔ اور سنئے۔ کان اِدھر لائیے۔ بات کان میں کہنے کی ہے۔ اس پھل میں تاثیر یہ ہے۔ کہ ایک بار زبان پر رکھ لیجئے تو بس سمجھ لیجئے کہ ہمیشہ ہمیش کے لئے جنت کے ہو گئے۔ بس یہیں جم گئے۔ آپ کو میری بات کا اور میری خیرخواہی کا یقین

مستقلاً وہ بجائے خود اس قابل ہیں۔ کہ ایک نظر اُن پر بھی ہوتی جائے پہلی بصیرت تو یہ حاصل ہوتی ہے۔ کہ انسان کی ہستی ذات باری سے بالکل جدا اور متمایز ہے۔ اور وہ ذاتِ پاک اس سے بالکل منزّہ ہے کہ انسان اِس کے ساتھ کوئی رشتہ مشارکت یا مجانست کا رکھے۔ آدم بس آدم ہی تھے خدا یا دیوتا۔ معبود اکبر یا معبود اصغر کسی معنی میں بھی نہ تھے۔ لیکن یہ کیا بات ہوئی؟ کیا کسی نے انسان کو خدا یا جز و خدا بھی سمجھا ہے؟ جی ہاں اس دنیا میں ایسے دانشمند بھی آباد ہیں۔ قوموں کی قومیں مشرکوں کی ایسی گزر چکی ہیں۔ جن کے نزدیک انسان اوّل جو تھا۔ دیوتا ہی تھا۔ اب بھی قبیلہ در قبیلہ ایسے ہیں جو انسان کے جدِ اوّل کی پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔ قرآن نے آفرینش آدم کا قصہ بیان کر کے اس مشرکانہ عقیدہ پر ضرب کاری لگا دی۔ اور یہ تعلیم عام کر دی کہ مخلوق اور خالق کے درمیان رشتہ داری کیسی؟ آدم اور آدم آفرین کے درمیان بجز وجود کوئی شئے مشترک ہی نہیں۔

دوسری تعلیم یہ ملتی ہے۔ کہ آدمؑ خلق ہوئے ہیں۔ نیست سے ہست ہوئے ہیں۔ عدم سے وجود میں آئے ہیں۔ یہ نہیں کہ پہلے سے کوئی مادّہ موجود تھا۔ آدمؑ کا قالب اس سے ترکیب دے لیا گیا۔ نہ یہ کہ پہلے سے حیوانی نوعیں موجود تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ نوع کے سب سے ترقی یافتہ فرد کا نام آدمؑ ٹھہرا دیا گیا۔ عقیدہ کی یہ دونوں گمراہیاں پہلے بھی عام

طرف واپس آنا ہوگا۔ وہاں ہماری ہدایتیں ہمارے قاصدوں کے ذریعہ سے پہنچتی رہیں گی۔ جو کوئی ہمارے قانون کے مطابق زندگی بسر کرے گا وہ یہاں آکر ہر طرح آرام پائے گا ــــ دنیا کھیتی ہے اور آخرت حاصل کشت!"

انہیں خدائی قاصدوں کا نام پیمبر پڑا۔ اور سب سے پہلے پیمبر حضرت آدم ہی ٹھہرے۔ وہی سب سے پہلے انسان بھی ہیں۔ جو زمین پر آئے اور وہی سب سے پہلے نبی ہیں۔ جو خدا کا قانون زمین پر لائے ــــ آدمؑ کا زمانہ تاریخ کی پیدائش سے قبل کا زمانہ ہے۔ اور ہمارا آسمانی نوشتہ ان کی زمینی زندگی کے متعلق بے نتیجہ تفصیلات میں نہیں پڑتا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ روئے زمین پر ملک سراندیپ میں آباد ہوئے۔ آج اسی کو سیلون کہتے ہیں۔

اہل فن کے قرائن و قیاسات یہ کہتے ہیں۔ کہ سب سے پہلے انسانی آبادی کی بنیاد ملکِ عراق، یا دجلہ و فرات کے دوآبہ میں پڑی۔ اولادیں آپ کی حضرت حوّا کے بطن سے متعدد ہوئیں۔ توریت میں نام تین بیٹوں کا آتا ہے۔ قابیل۔ ہابیل۔ شیث۔ اور یہ حضرت شیثؑ آگے چل کر پیمبر بھی ہوئے توریت ہی کی روایت ہے کہ آپ نے عمر ۹۳۰ سال کی پائی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سرگزشت حیات نبی اول کی ختم ہوگئی۔ قرآن مجید نے چند سبق جو اس سادہ رودادِ حیات کے ذریعہ سے دے دیئے ہیں۔ کچھ ضمناً اور کچھ

کہ ملائکہ کو حکم ہوا ہے اِسکی تعظیم کا اِس کا جُھکنا ملائکہ پرستی کی جانب، عناصر پرستی کی جانب، کواکب پرستی کی جانب، اصنام پرستی کی جانب، ذہن کی پستی کا فہم کے انحطاط کا آخری نقطہ ہے ۔

چھٹا پہلو یہ ہے کہ کوئی انسان بزرگ سے بزرگ بھی خطا و میلانِ عصیاں سے محفوظ نہیں ۔ اجتہادی لغزشیں پیمبروں تک سے ممکن ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ جس کا تعلق اس سے جتنا زیادہ جُڑا ہوا اور مضبوط ہوتا ہے ۔ اسی نسبت سے جلد تر وہ سنبھل جاتا ہے اور نبی کو معصیت پر جمنے نہیں دیا جاتا ۔

ساتویں بات یہ معلوم ہوئی ۔ کہ معصیت یا لغزش کے بعد توبہ کا دروازہ بالکل کُھلا رہتا ہے ۔ اور اگر ندامت دل سے ہے ۔ تو اس داغ کو دُھلتے کچھ دیر نہیں لگتی ۔ اور توبہ کے بعد مرتبۂ مقبولیت پر بحالی ۔

آٹھواں مسئلہ یہ حل ہوا کہ قبولِ توبہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ معصیت کے جسمانی و مادّی اثرات بھی زائل ہو جائیں ۔ اور تکوینی و طبعی نتائج سے رہائی مل جائے ۔

نواں سبق یہ حاصل ہوا ۔ اسی قصّہ کے ضمنی قصہ واقعہ ہابیل سے ، کہ محض بزرگ زادگی ہرگز کام نہیں آتی ۔ قابیل حضرت آدمؑ کا آخر صلبی ہی بیٹا تھا ۔ اپنی قوت ارادی کو صحیح مصرف میں نہ لایا ۔ اختیار سے صحیح کام نہ لیا نتیجہ یہ ہوا کہ قتل انسانی ، برادر کشی جیسی خونی معصیت سے اپنے ہاتھ رنگین کر گئے ۔

رہ چکی ہیں۔ اور آج بھی خدا معلوم کتنے مشرک مزاج انہیں گمراہیوں کے شکار ہیں۔

تیسرا سبق یہ ملتا ہے۔ کہ آدم اللہ کے عبد اور خلیفہ تھے۔ اس کے مظہر یا اوتار نہ تھے۔ قوانین تکوینی کے پابند، احکام شرعی کے مکلّف، بالکل اسی طرح جیسے آپ کے بعد سے سارے آدم زاد آج تک چلے آرہے ہیں۔ مشرک قوموں کے نزدیک، مشرکانہ مذہبوں کے نزدیک انسانیت اور الوہیت گویا ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ فرق صرف اعلیٰ اور ادنےٰ کا ہے۔ قرآن نے شرک کی یہ ریڑھ کی ہڈی توڑ کر رکھ دی۔

چوتھی ضرب اس قصہ نے ملائکہ پرستی پر لگادی۔ مشرک قومیں اپنے عقیدہ میں دیوتا انہی ہستیوں کو کہتی تھیں۔ اور انہیں عالم میں متصرّف اور کائنات کے مختلف شعبوں میں حاکم سمجھتی تھیں۔ اسلام نے آکر بتایا کہ قوّتِ تصرّف اور قدرت تو الگ رہی۔ ملائکہ کا علم بھی کامل نہیں انسان کی طرح وہ بھی قیاس اور فراست ہی سے کام لے سکتے ہیں۔ اور انسان ہی کی طرح ان کا علم بھی خدائی تصحیح کا محتاج رہتا ہے۔

پانچواں علم یہ حاصل ہوا کہ بشر کی ہستی اپنے خالق کے مقابلہ میں اس سے بھی زیادہ حقیر و پست ہے۔ جتنی آفتاب کے مقابلہ میں ذرّہ کی ہوتی ہے تاہم مخلوقات میں بشر کا مرتبہ سب سے افضل، سب سے اعلیٰ ہے۔ یہاں تک

کا خاندان تو اپنی درازعمری کے لئے مشہور بھی تھا۔ آپ کے والد کی عمر ۷۷۷ سال کی ہوئی تھی۔ آپ کے دادا کی ۹۶۹ سال کی۔ اور اس سے اوپر کی پشتوں میں تو بجز ایک کے اور سب ہی کی عمر نو سو سال سے کچھ کم یا زائد ہی ہوئی ہے، توریت میں یہ ساری صراحتیں موجود ہیں۔ اور ان کی نفی پر کوئی ایک شہادت بھی موجود نہیں۔ آپ کا وطن وہی تھا جو اسوقت تک انسانیت کا وطن تھا یعنی دجلہ فرات کا دوآبہ اب اسے عراق کہتے ہیں پہلے کبھی کالڈیا یا کلدانیہ نام تھا، اور کبھی بابل یا Baby lonia شمالی سرحدیں آرمینیا سے ملی ہوئی ہیں آدمؑ کا خاندان اُس وقت اتنا پھیلا ہوا کہاں سے ہو سکتا تھا۔ کہ سارے روئے زمین کو یا بڑے بڑے براعظموں کو گھیر لے کل دس ہی نسلیں تو انسان کے وجود میں آئے ہوئے ہوئی تھیں۔ جتنی بھی انسانی آبادی تھی سب کے لئے وہی عراق کا زرخیز علاقہ بہت تھا لیکن اب جنت سے نکلے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ خو بو وہاں کی کچھ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ روحانیت کی بلندیوں کی جگہ لے لی تھی مادیت کی پستیوں نے زمینی رنگینیوں نے، شیطانی دلچسپیوں نے بدعملی سے گزر کر نوبت بدعقیدگی تک پہنچی۔ اور جو توحید کی منادی کرنے بھیجے گئے تھے۔ وہ لگے خود دیویوں کے آگے جھکنے، دیوتاؤں کے آگے گرنے۔ آج دنیا میں ترقی تمدن کا ایک بڑا معیار بت تراشی مجسمہ سازی (Sculp ture) ہے عظمت و اقبال کا یہ پیمانہ آج سے ۵ ہزار سال قبل

دسویں بات کام کی یہ معلوم ہوئی۔ کہ آدمؑ و نسل آدمؑ اپنے خالق کی نظر میں ایک معزز مخلوق ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ اس پر آیت ناطق ہے۔ نعوذ باللہ ایسا نہیں ہے کہ اللہ میاں انسان کو بنا کر پچھتاتے ہوں۔ اور افسوس کیا ہو کہ میں نے ناحق ایسی مخلوق بنا ڈالی! ـــــ یہ مفروضہ کوئی موہوم نہیں رہا یہودیت جیسے قدیم و مستند اور مسیحیت جیسے عالمگیر، دونوں مذہبوں کی کتاب مقدس میں آج تک یہ لکھا چلا آرہا ہے۔

"خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا۔" (پیدائش ۶:۶)

نوح و سفینۂ نوح

حضرت آدمؑ پر اب فاتحہ خیر پڑھیئے۔ اور ان کے بیٹوں، پوتوں سے نظر بچاتے ہوئے سفینۂ نوحؑ تک پہنچ جایئے۔ حضرت نوحؑ فرزند تھے لامک کے۔ اور حسب روایت توریت آپ کا سلسلۂ نسب حضرت آدمؑ تک دسویں پشت میں پہنچتا ہے۔ قرآن مجید نے آپ کی عمر نوسو پچاس سال کی بتائی ہے اس وقت کی اوسط عمر دیکھتے ہوئے یہ حیرت انگیز بھی نہیں۔ اور آپ

عذاب سے ہلاک، طوفان سے غرق، ہو کر رہے گی۔ تم اپنے اور اپنے والوں کے لئے سفینۂ نجات کی تیاریاں کرو۔

حضرات انبیاء کو آج کل کے "توکّل پیشہ" نذر و نیاز کے منتظر، مشایخ پر قیاس نہ کیا جائے۔ بڑے عملی، بڑے مستعد، بڑے کارگذار ہوا کئے ہیں۔ جہاز سازی کے فن میں آپ اناڑی انیلے نہ تھے۔ ایک خاصہ بڑا جہاز اوپر نیچے تین درجوں کا تیار کر لیا۔ توریت میں اس کی پیمایش تک دی ہوئی ہے۔

"اس کی لمبائی ۳۰۰ ہاتھ اور اس کی چوڑائی ۵۰ ہاتھ اور اس کی اونچائی ۳۰ ہاتھ کی"

(پیدائش ۶: ۱۵)

گویا اتنا بڑا جہاز، جیسے مسافروں کے جہاز یا Liners برطانیہ اور امریکہ کے درمیان عموماً چلا کرتے ہیں لیکن ہاتھ جس لفظ کا ترجمہ اردو توریت میں کیا گیا ہے۔ انگریزی میں اس کے لئے (Cubit) آتا ہے اور (Cubit) کا طول، عرض، عمق خود ہی گفتگو کی بڑی گنجایش رکھتا ہے۔ اس لئے اوپر کی پیمایش کو قطعی نہ سمجھیئے۔ بعض دوسری روایتوں میں اس کی دوگنی پیمایش ملتی ہے۔ اگر اسے قبول کیا جائے تو سفینۂ نوح، برطانیہ کے بڑے جہازوں کوئین میری Queen Marry وغیرہ سے بھی کہیں بڑا ٹھہرتا ہے۔

بارش کے خالق کا حکم ہوا۔ اور ادہر زمین کے سوتے پھٹ گئے اُدہر

کی بھی "مہذب" دنیا میں رہ چکا ہے۔ نوحؑ کی "مہذب و متمدن" قوم نے اپنے بلند پایہ اسلاف کے، اپنے قومی (Heroes) کے مجسمے بنائے کہ ان سے ان کے کارناموں کی یاد قایم رہے گی۔ یادگاریں دیکھتے دیکھتے پرستش گاہیں بن گئیں۔ اور بڑے بڑے ستارے اور بڑے بڑے پرند اور خدا معلوم خاک بلا اور کیا کیا، بے تکلف پجنے لگے! — خلیفۃ اللہ اپنے مرتبہ اور مقام کو یکسر فراموش کر گیا!

نوحؑ نے سمجھایا بجھایا۔ ڈرایا دھمکایا۔ ناصحوں کی اب کب سنی جاتی ہے۔ جو اس وقت سنی جاتی۔ زبان نے کبھی زبان سے ہار مانی ہے دلیل صحیح کے جواب میں کج بحثی، برہان عقلی و نقلی کے مقابلہ میں کٹھ حجتی! خیر۔ اگر نوحؑ کی پکار کو سنی ان سنی کرتے رہتے۔ جب بھی غنیمت تھا ضد نے اور الٹی مخالفت پیدا کر دی۔ کہ یہ کیسا تاریک خیال ہے۔ خواہ مخواہ حایل ہو رہا ہے۔ ہماری روشن خیالیوں کی، آزادیوں کی راہ میں۔ فتوے کفر و شرک کے لگا رہا ہے، ہمارے آرٹ کے کمالات پر۔ ہمارے لطیف جذبات پر! مخالفت نے عداوت کا رنگ پکڑا۔ اور اب اپنے اصلی دوست اور حقیقی خیر خواہ کے ساتھ برتاؤ شروع ہوا — جو کٹّے دشمنوں، شدید بدخواہوں کے ساتھ کیا جاتا ہے — پیمبر بھی بشر ہی ہوتا ہے۔ بشر نے عاجز ہو کر، ہر تدبیر سے تھک کر، ہر کوشش سے مایوس ہو کر آخر دعا خالق بشر سے کی۔ جواب ملا کہ بحرِ عصیاں میں ڈوبی ہوئی قوم پانی کے

عذاب الٰہی کی بے پناہی، معاذ اللہ! جب چاہیں پانی سے آگ کا کام لیں، اور جو زندگی کا سہارا ہے، اسی کو ہلاکت کا واسطہ بنا دیں۔ پانی جس کے حکم سے برستا تھا اور اُبلا تھا، بالآخر اسی کا حکم پہنچا آسمان کو کہ بارش تھم جائے۔ اور زمین کو کہ پھر سے خشک ہو جائے۔ معاً تعمیل ہوئی۔ اور کشتی کوہستان ارارات کی ایک چوٹی جبل جودی پر جا ٹھہری، توریت میں ہے کہ کشتی ارارات کے پہاڑوں پر ٹک گئی۔ اور توریت کے شارحین کا کہنا یہ ہے۔ کہ توریت کا یہ حوالہ تو مبہم (Indefinite) سا ہے (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۲، صفحہ ۲۴۸) عرب کے اُمّی کی لائی ہوئی کتاب نے اس ابہام کو صاف کر دیا۔ متعیّن طور پر نام جودی کا لے دیا اور آج بیان، قرآن کے مفسّروں کا نہیں۔ بائبل کے علماء کا یہ ہے۔ کہ پڑوس کے رہنے والے اور مقامی واقفیت رکھنے والے "کُردوں کا خیال کشتی کے رُکنے کے مقام کے لئے اسی (جودی) کا ہے۔"

(ہیسٹنگز، ڈکشنری آف دی بائبل، جلد اوّل صفحہ ۱۴۴)

اور انہیں کی زبان یہ گواہی بھی دے رہی ہے۔ کہ

"شہادت اسکی موجود ہے۔ کہ جس پہاڑی پر کشتی رُکی تھی وہ جبل جودی ہی ہے جھیل (Uan) کے جنوب و مغرب میں"

(انسائیکلوپیڈیا ببلیکا۔ کالم ۲۹)

ایک زمانہ تھا۔ اور اسے ابھی بہت روز نہیں ہوئے ہیں۔ کہ طوفان

بادلوں کے منہ کھل گئے۔ توریت کی روایت ہے کہ دن رات ۴۰ دن تک مینہ کی جھڑی لگی رہی۔ زمین کے اندر سے جو پانی اُبلا حساب ہی نہیں۔ جل تھل بھر گئے ——————— پانی اونچا ہوا سروں سے اونچا ہوا۔ گھروں سے اونچا ہوا۔ درختوں کو چھا لیا۔ حد یہ ہے کہ پہاڑوں کو ڈھانپ لیا۔ سفینۂ نوحؑ، کہتے ہیں کہ پانچ مہینہ تک یا بہ الفاظ توریت ۱۵۰ دن تک سطحِ آب پر رواں رہا۔ وہی اُس وقت دنیا کے پردہ پر ایک نجات گھر تھا۔ جو اُس میں سوار ہوا بچ گیا۔ جو باہر رہا۔ ڈوب مرا۔ راہ میں نوحؑ کو اپنا لڑکا کنعان نظر پڑا۔ پیرتا ہوا سطحِ آب کو چیرتا ہوا کسی طرف کو نکلا جا رہا ہے۔ آواز دی "جان پدر! یہ سیلاب کی موجیں نہیں، قہر الٰہی کی فوجیں ہیں ہلاکت سے امن آج کہیں نہیں۔ پناہ صرف میرے سفینہ میں ہے۔" لڑکا باپ کی نسل سے تھا، باپ کے دین پر نہ تھا۔ قوت کے زعم اور پندار کے نشہ میں بڑھتا چلا گیا بیٹا سے بے چین باپ نے دعا کی۔ کہ بارالٰہا! رحم۔ مجھ سے تو وعدہ یہ ہو چکا ہے کہ میرے والے سب کے سب بچا لئے جائیں گے اور اس سے بڑھ کر میرا والا اور کون ہو سکتا ہے۔ جواب ملا۔ کہ نوح! خبردار۔ وہ تم سے ہے۔ پر تم پر نہیں پڑا۔ وہ تمہارا والا ہے کب؟ تمہارے والے تو وہ ہیں جو تم پر ایمان لا چکے ہیں۔ یہ ارشاد ہوا اور مومن باپ کی آنکھوں کے سامنے کافر بیٹا غریقِ رحمت ہونے کے بجائے غریقِ لعنت ہو کر رہا۔

طوفان کے وقوع کو قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے۔" (صد ۲۲۶)

ایک نہیں متعدد شہادتیں آپ نے سائنس کی زبان سے سن لیں! اب صرف تعین باقی رہ جاتا ہے۔ وقت اور مقام کا، مکان اور زمان کا۔ توریت کے نسخہ سبعینہ (Septuagint Version)[۱] کا جو ترجمہ عبرانی سے یونانی میں کوئی تین سو سال قبل مسیح ہوا تھا۔ اس کے حوالہ سے مشہور ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن لکھتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش سنہ ۱۰۷۲ طوفانی میں ہوئی تھی۔

اور حضرت ابراہیمؑ کی

تاریخ ولادت سنہ قبل ولادت مسیح کے حساب سے معلوم ہے اِس حساب سے طوفان کی تاریخ تقریباً سنہ ۳۲۰۰ ق۔م۔ قرار پائی ہے، یعنی آج سے سمجھئے کوئی ۵۱۴۲ سال قبل البعض اور تخمینے، اور روایتیں سنہ ۲۴۰۰ ق۔م۔ سے متعلق بھی ہیں۔

طوفان کی عالمگیری کی مدعی بائبل ہو تو ہو۔ قرآن مجید کا یہ دعویٰ نہیں قرآن تو صرف یہ کہتا ہے کہ نوح کی امت دعوت یعنی بدکاروں نافرمانوں کی ساری قوم کی قوم ڈبو دی گئی۔ اور وہ قوم عراق عرب اور نواح آرمینیا کے علاقوں میں آباد تھی۔ طوفان بہ طور عذاب تھا اور عذاب ظاہر ہے۔ کہ صرف نافرمانوں پر

---

[۱] اس ترجمہ میں ستر یا بہتر علماء و ماہرین شریک تھے۔

نوح کا نام زبان پر لانا" روشن خیالی" کو تمسخر و استہزاء کی دعوت دینا تھا۔ پر اللہ کا کرنا کہ انیسویں صدی کی " روشن خیالی" اس بیسویں صدی میں خود قابل مضحکہ ٹھہر گئی۔ اور جو زبانیں انکار و تکذیب پر دلیر تھیں، فرشتوں کی لائی ہوئی وحی کی، انہیں گنگ ہو جانا پڑا، زمین والوں کی شہادتیں سُن سُن کر۔ طبقات الارض (جیالوجی) اور اثریات (آرکیالوجی) والوں کے بیانات پڑھ پڑھ کر اکل تک انکار طوفان عظیم کے نفس وقوع سے تھا۔ آج مشہور و معروف ماہرِ اثریات سر لیونارڈ وولی (Wolley) کہتے ہیں:۔

" اُور کی سرزمین سے معقول شہادت اس کے وقوع کی بہم پہنچ گئی ہے ...... سیلاب بہت وسیع لیکن مقامی تھا"

(وولی کی ' ابراہام' ص۱۷)

Ur اور علاقۂ عراق کا قدیم مشہور شہر تھا۔ گویا طوفان کا نفس وقوع اور بہت بڑے پیمانہ پر وقوع پر سائنس کے اس نمائندہ کو بالکل تسلیم ہے۔ دوسرے محقق سر چارلس مارسٹن لکھتے ہیں:۔

" اثری تحقیقات نے .... طوفان کے وقوع کو ثابت کر دیا ہے"

اور ویلنٹائن کی تازہ جیوئش انسائیکلو پیڈیا میں ہے:۔

" لینگڈن نے جو کھدائی شہر کِش میں اور وولی نے شہر اُور میں ۱۹۲۹ء میں کی۔ اس نے ایک عظیم الشان اور بے مثال

وتکمیل احکام کی ضرورت تو حضرت نوحؑ کے زمانہ سے پڑی۔ اور آپ پہلی شریعت لے کر آئے۔ اب جو انسانی آبادی ہے۔ آپ ہی کی نسل سے ہے۔
حکمتیں، عبرتیں، بصیرتیں آپ کے قصہ میں بہت سی ہیں۔ سب کو بیان کرتے اگر بن نہیں پڑتا۔ تو سب کو چھوڑتے بھی نہیں بنتا۔
پہلی بات یہ ہے۔ کہ پتھر میں جونک جس طرح مادّی دنیا میں نہیں لگتی۔ روح و اخلاق کی دنیا میں بھی نہیں لگتی۔ انبیاء سے بڑھ کر پُر اثر تبلیغ اور مخلصانہ کوشش کس کی ہوسکتی ہے لیکن مخاطبین کے دل جب فسق عملی و اعتقادی کی کثرت و شدّت سے پتھر بن جائیں۔ تو ہر آواز ایسے کانوں کے لئے بے کار رہی رہتی ہے۔
حضرت نوحؑ کو تبلیغ کے لئے مدّت کتنی وسیع ملی لیکن سننے والوں کو اپنی اصلاح منظور نہ ہوئی۔ اس لئے پیمبرؑ کی بھی ساری کوششیں بے اثر رہیں۔ انسان خود جب تک قبول حق کے لئے نہ تیار ہو۔ ناصح کی ہر تبلیغ گویا چکنے گھڑے پر پانی کا پڑنا ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ غفلت و انکار کے لئے مہلت ملتی ہے لیکن وہ مہلت بھی غیر محدود نہیں ہوتی۔ ایک مدّتِ موعود کے بعد عذابِ الٰہی کے حرکت میں آنے کا وقت آجاتا ہے یہ وقتِ موعود، فرد و جماعت دونوں کے ڈرنے کی چیز ہے۔

ہی آتا ہے۔ اس لئے۔ اگر آج پانچ ہزار سال قبل کے دریائی جانوروں کے ڈھانچے اہل فن کو صرف ارارات کی چوٹیوں پر نظر آئے ہیں۔ اور سائبیریا کے برفستان میں یا راجپوتانہ کے ریگستان میں نظر نہیں آئے ہیں، تو اس سے ضرر قرآن کریم کے کسی دعوے کو شمہ برابر بھی نہیں۔ یہاں تک کہ لفٹننٹ کرنل (Wag Staff) کے خیال کے مطابق طوفانی علاقہ کا رقبہ صرف ..۴ میل طول میں اور ..۱ میل عرض میں ثابت رہے۔ جب بھی مطلق مضایقہ نہیں۔ وہ قوم بس اتنے ہی رقبہ میں آباد ہو گی ——— البتہ ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ خود نسلِ آدم کی آبادی بھی تو اُس وقت اُسی خطہ تک محدود تھی۔ اور انسان کا خاندان اس کے آگے پھیلا ہی نہ تھا! اِس لئے سچ کہا جس نے بھی کہا۔ ہمارے مفسروں میں سے۔ محدثوں میں سے، کہ طوفانِ نوح نے سارے عالم انسانی کو غرق کر دیا!

حدیث میں نوح کے لئے لفظ اوّل المرسل' کا آیا ہے۔ یعنی آپ، دنیا کے سب سے پہلے رسول تھے۔ نبی کہتے ہیں ہر صاحب وحی کو (وحی لفظی معنی میں نہیں اصطلاحی معنی میں) اور رسولؐ کے لئے ضروری ہے۔ کہ صاحبِ وحی ہونے کے ساتھ ہی صاحب شریعت بھی ہو۔

حضرت آدمؑ کے وقت میں تمدن اپنی انتہائی سادہ شکل میں تھا۔ احکام بھی وقت کے مناسب حال ویسے ہی سادہ مستقل شریعت کی مفصل

کا سلسلہ چل رہا ہے، پھیل رہا ہے، بڑھ رہا ہے۔ سلسلے ہدایت کے اور ضلالت کے، دونوں کے جاری ہیں نئے نئے ملک آباد ہو چکے ہیں۔ قومیں بن چکی ہیں، اور بگڑ چکی ہیں۔ گر چکی ہیں، اور اُبھر چکی ہیں۔ حضرت ادریسؑ اور ان کی تعلیمات، حضرت ہودؑ اور ان کی امت قومِ عاد، حضرت صالحؑ اور انکی امت قوم ثمود، یہ سب عنوانات دلچسپ بھی ہو سکتے تھے اور سبق آموز بھی۔ لیکن آج کی مختصر و سرسری صحبت میں اتنی گنجائش کہاں؟ تاریخ مسلسل کے ان سارے درمیانی اوراق کو اُلٹ جائیے، اور اب نبی محترم ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کے دَور میں آجائیے۔

جہل و بے خبری بھی عجیب چیز ہے۔ اور دیکھنے میں یہ آیا ہے۔ کہ جو وحی کے منکر ہوتے ہیں۔ وہ خود علم و عقل کے بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔ زیادہ نہیں چالیس ہی پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ کہ "روشن خیالی" نے حضرت ابراہیمؑ کے وجود ہی سے انکار کر دیا تھا، اور یہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ کہ "اس نام کی کوئی شخصیت ہی نہیں گزری ہے۔ اور یہ نام تو نوعی نام شیخ قبیلہ کا ہے"۔ حضرت ابراہیمؑ، یہود و مسیحی دونوں قوموں کے مستند پیمبر اور مسلّم امام ہیں، ان دونوں کے "عقلیت زدہ روشن خیالوں" نے بے تامّل اپنی محققانہ کتابوں میں، اپنی انسائیکلو پیڈیاؤں میں یہی رنگ قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور کچھ عجب نہ تھا۔ کہ یہ بلا ہمارے ہاں بھی پہنچ جاتی۔ کہ زمانہ نے ایک اور

تیسری چیز یہ ہے کہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کا پاسپورٹ (پروانۂ راہداری) نسل و خاندان نہیں۔ ایمان و عمل ہے۔ کنعان سے بڑھ کر بزرگ زادہ اور کون ہوگا؟ پیرزادہ۔ مرشدزادہ۔ شیخ زادہ نہیں پیمبرزادہ تھا۔ لیکن جب قابیل کی طرح نافرمانی پر تُل گیا۔ تو سابقہ اسی قانون سے پڑا، جو ہر آدم زاد کے لئے رکھ دیا گیا ہے۔ ہلاکت سے نہ کوئی مادی تدبیر بچا سکی۔ نہ کوئی نسبی قرابت۔

چوتھا سبق یہ ہاتھ آیا۔ کہ اس عالم اسباب میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے۔ واسطہ، اسباب ظاہری کا رکھا جاتا ہے۔ نوح و آلِ نوح کو طوفان سے بچایا گیا۔ تو سفینۂ نوح ہی کے واسطہ سے۔

پانچویں تعلیم یہ حاصل ہوئی۔ کہ پیمبر اپنے علم میں، قدرت میں، اختیار میں، بشریت کے حدود سے سرمو باہر نہیں ہوتا۔ حضرت نوحؑ کا اتنا بھی بس نہ چلا۔ کہ اپنے ڈوبتے ہوئے فرزند ہی کو بچا لیتے۔ یا اُسے ایمان لانے پر مجبور کر چھوڑتے اور یہ تو خیر پھر دور کی چیزیں ہیں۔ اس کے انجام کا علم تک آپ کو قبل سے نہ ہو سکا۔

ابراہیم خلیلؑ

داستانِ نوحؑ ختم ہوئی۔ اب دنیا از سرِنو آباد ہے۔ آپ کی اولادؑ

دریا کا ساتھ چھوڑ کر جانب مغرب اور چلئے ½ ۸ میل پر بغداد و بصرہ ریلوے لائن کو عبور کریں گے۔ اور یہاں تک آپ کو جابجا آبادی ملتی رہیگی کہیں کہیں کہیں کھیتی باڑی اور کہیں کہیں کچے مکان اور جھونپڑے، آپ اسی سمت قدم بڑھائے چلئے۔ اب بالکل ویرانہ شروع ہو جائے گا۔ دشت و میدان، ایک ہو کا عالم۔ ڈیڑھ میل اور چلئے لیجئے۔ اب آپ کے قدم اُور کے کھنڈروں پر پڑنے لگے۔

یہ تھا وہ مقام جو آپ کی ولادت سے مشرف ہوا کبھی زمانہ میں یہ مقدس شہر تھا۔ آثار تمدن کثرت سے، زمین کے تہ خانوں سے برآمد ہوئے ہیں۔ توریت کی روایت ہے۔ کہ آپ کے اور حضرت نوحؑ کے درمیان دس پشتوں کا فرق ہے یعنی آپ ان کی گیارہویں پشت میں ہیں۔ البتہ دوسرے قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ توریت کے دیئے ہوئے نسب نامہ میں کچھ پشتیں چھوٹ گئی ہیں۔ سال ولادت آپ کا سر چارلس مارسٹن کی جدید ترین تحقیق کے مطابق سنہ ۲۱۶۰ ق۔م ہے۔ اور عمر شریف آپ کی جیسا کہ توریت میں درج ہے۔ ۱۷۵ سال کی ہوئی۔ سنہ وفات اس حساب سے سنہ ۱۹۸۵ ق۔م ٹھہرتا ہے:۔

دنیا، متمدن دنیا، کا مذہب اُس وقت بھی شرک کا تھا جکو مت کا مذہب مشرکانہ، قوم کے رسوم و آداب مشرکانہ جس گھرانے میں آپنے

کروٹ لی تحقیقات کا رُخ بدلا۔ اور زبردست اثری شہادتوں کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ، ان کا وطن، ان کا مذہب، یہ سارے نظریات پھر از سرِ نو حقایق بن گئے۔

پیدایش آپ کی قدیم کلدانیہ یا موجودہ عراق کے شہر اُور میں ہوئی صرف شہر کا نام اب تک توریت کے صفحات میں محفوظ تھا۔ نفس شہر جغرافیہ کے نقشوں سے مدت ہوئی غایب ہو چکا تھا۔ سینکڑوں نہیں، ہزاروں سال غایب رہنے کے بعد اب پھر نمودار ہو گیا ہے۔ کھدائی کے کام کی داغ بیل تو سنہ ۱۸۵۴ء ہی میں پڑ چکی تھی۔ ہوتے ہوتے آخر سنہ ۱۹۲۲ء میں جو زبردست اثری مہم برٹش میوزیم اور امریکہ کی (Pennsy Louania) یونیورسٹی کے مشترکہ سرمایہ سے روانہ ہوئی۔ اس نے کھدائی کا کام برابر سات برس تک جاری رکھا۔ اور اس کے خاتمہ پر دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء میں اس مہم کے صدر سر لیونارڈ وولی (Wolley) نے ایک مستقل کتاب (Ur of the chaldeans) کے نام سے لکھ دی۔

عراق کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے پورے شہر کو عجایب خانہ کے حکم میں لا کر اسے محفوظ کر دیا ہے۔ خلیج فارس کے ساحل سے شمال و مغرب کے رُخ پر دریائے فرات کے کنارے کنارے چلئے۔ تو پایۂ تخت یعنی شہر بغداد ابھی آدھی دور باقی ہو گا۔ کہ آپ اُور کے محاذ میں پہنچ جائیں گے۔ اب

بعد کو چھپائیے گا؟

باپ بگڑ کر بولے۔ کہ "تو اپنے ہوش میں ہے؟ بد مذہب تو خود ہو چکا ہے اور چلا ہے اُلٹا مجھے نصیحت کرنے۔ بس رہنے دے اپنا وعظ۔ اپنی خیریت چاہتا ہے۔ تو چپکا رہ، نہیں تو مارے پتھراؤ کے بُرا حال کر دوں گا۔" سعادت شعار بیٹے نے جواب دیا کہ "خیر، آپ کو اور آپ والوں کو تو چھوڑتا ہوں۔ باقی آپ کے حق میں دعا جاری رکھوں گا۔"

قرآن، ابراہیمی زندگی کا ایک منظر اور دکھاتا ہے۔ آپ نے ایک روز کیا کیا، کہ ایک تاروں بھری رات میں صحن میں آ گئے۔ زحل اور مشتری، مریخ اور عطارد اور زہرہ یہ سب ہی پُوجے جا چکے ہیں، اور اب بھی پُج رہے ہیں۔ انہیں میں سے یا کسی اور بڑے روشن تارے کی طرف نظر جما کر بولے، کہ "ہو نہ ہو۔ یہی تارا میرا دیوتا ہے۔ دیوتا بننے کی صلاحیت ہے تو اسی میں۔" رات کچھ اور بڑھی، اور اسی کے ساتھ ساتھ تارا بھی کھسکا۔ آئیں! یہ کیا؟ یہ تارا بھی آزاد و خود مختار نہیں، کسی آئین میں جکڑا ہوا۔ کسی قانون کا پابند، کسی کے احکام کا محکوم ہے۔ اور لیجئے۔ روشنی بھی تو اس کی ماند پڑنے لگی۔ لاحول پڑھ آپ نے اُدھر سے منہ پھیرا۔ چاند نکلا، اور رات کی اندھیریاں اُجالے سے بدلیں۔ اہا۔ یہ چندرماں دیوتا تو دنیائے شرک کے بڑے جانے پہچانے ہوئے ہیرو ہیں۔ قوموں کی قومیں ان کی خدائی کی قائل اور واقعی ان کی عظمت کا، اِنکی

آنکھیں کھولیں۔ اس میں چرچے ہر طرف شرک بت پرستی کا بھی، کواکب پرستی کا بھی، اصل معبود آسمان میں لٹکے ہوئے، ان کی مورتیں پتھروں کی کٹی اور تراشی ہوئی زمین پر مندروں کی رونق، دیوی دیوتاؤں کی مورتیں اس لئے کہ خود ان کی پوجا کی جائے۔ اُن پر چڑھاوے چڑھائے جائیں۔

نبیؑ برحق کے والد کا نام تھا تارخ یا عربی تلفظ میں آزر۔ نام کا تلفظ قدیم ماخذوں میں کئی کئی طرح آیا ہے مسلمانوں کے لئے آزر کافی ہے اپنے زمانہ کے بڑے صنّاع یا آرٹسٹ تھے۔ بے جان میں اپنی صنعت گری سے جان ڈال دیتے تھے۔ مورتیاں پتھر کی، اور شاید لکڑی کی بھی اس صنّاعی سے تراشتے، کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔

چراغ پہلے گھر ہی میں جلتا ہے۔ بیٹے نے تبلیغ کی ابتداء باپ ہی سے کی۔ بولے: "ابا جان! یہ آپ کو کیا ہوا ہے۔ آپ پوجا ان مورتیوں کی کرتے رہتے ہیں؟ انہیں پکاریئے۔ تو سن نہ سکیں، کچھ دکھائیے تو انہیں سوجھ نہ پڑے۔ کسی کام میں ان کی مدد چاہیئے تو آپ کے کام نہ آسکیں۔ صلاح میری مانئے۔ راہ میری اختیار کیجئے۔ مجھے وہ علم و ہدایت کی روشنی مل چکی ہے۔ جو آپ تک نہیں پہنچی ہے۔ ان شیطانی خرافات پر لعنت بھیجئے۔ دین توحید کا اختیار کیجئے۔ نہیں تو پھر آپ ہی

تُشْرِكُوْنَ ، اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ	خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں اس سے بری ہوں بیزار ہوں! کیسا آفتاب اور کہاں کا ماہتاب! میں نے اپنی لو لگائی ہے! اس ہستی سے جو خالق ہے آسمان اور زمین کا (اور اُن سب پر حاکم و متصرّف) اور میں مشرکین کے دین سے بالکل تبرّی کرتا ہوں۔

ہو سکتا ہے (جیسا اکثر مفسرین کا خیال ہے) کہ یہ ماجرا ابراہیمؑ کی کم سنی کا ہو، فطرتِ سلیم شروع ہی سے لے کر آئے تھے۔ آخر آگے چل کر نبی ہونے ہی والے تھے۔ اور ہو سکتا ہے (جیسا قرآن کے لفظ یٰقَوْمِ، آپ کے تخاطب قوم سے متبادر ہوتا ہے) کہ آپ نے پیمبری کے بعد اس استدلال کا مظاہرہ قوم کے سامنے اس کی رہنمائی کے لئے کیا ہو۔

بہر حال اس کے بعد کی منزل وہی تھی جو ہونی ہی تھی، یعنی وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ مشرک قوم ٹوٹ پڑی موحّد پر، بحث و حجّت کے بجائے کج بحثی اور کٹھ حجتی کے لئے۔ ڈراوے اور دھمکیاں اس پر مستزاد۔ آپ نے فرمایا اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ۔ ارے تم چلے ہو توحید جیسی صاف صریح حقیقت میں مجھ سے بحث و جدال کرنے۔ اور پھر جب اللہ مجھے ہدایت سے سرافراز کر چکا، رہے تمہارے ڈراوے اور دھمکیاں، سو خدا کی شان

نورانیت کا کیا ٹھکانا، مگر لیجئے یہ کیا؟ ارے یہ بھی تو لگے تاروں ہی کی طرح جھلملانے، سرکنے، اپنی جگہ چھوڑنے، اور رفتہ رفتہ بے نور ہونے! لاحول ولاقوۃ! یہ بھی کوئی خدائی ہے؟ یہ تو صاف نقشہ ہے بندگی کا۔ بے بسی کا، بے چارگی کا چلئے، چھوڑیئے انہیں بھی، اب کی بھی کیسا دھوکا ہوا۔ لیکن اب دھوکا نہ ہوگا وہ دیکھئے نا، خسروِ خاوری کا نورِ اقبال، ظہورِ اجلال! رات کی سیاہ چادر تو آمد آمد ہی سے کافور ہوگئی۔ یہ بے شک اس قابل ہے ——————

کہ بڑائی اس کی مانی جائے۔ اور اپنی بندگی اور چاکری کی نسبت اسی سے جوڑی جائے۔ ہندی اور جاپانی، مصری اور ایرانی، رومی و یونانی آخر سب ہی نے ان سورج دیوتا کو مانا ہے اور اپنے اپنے دھرم کا چراغ انہیں سے روشن کیا ہے۔ فکر و استدلال کی یہ کڑیوں پر کڑیاں ملتی جاتی تھیں، کہ لیجئے۔ اُدھر وقتِ زوال آگیا، عروج کُل دوپہر کا! عروج کے بعد زوال، اور زوال کے بعد غروب! آئے دن کا مشاہدہ، اور زبانِ فطرت کا روزمرّہ! وہ جو بینائی کو خیرہ کر دینے والا نور مجسّم تھا، خلق کی نظر میں مکرّم تھا، معظم تھا، لگا زرد رُو مجرم کی طرح منہ چھپانے، افق کے دامن میں پناہ لینے، یہاں تک کہ بالکل غایب! پتہ نشان ڈھونڈھے بھی نہ ملے! ———— زبانِ حق ترجمان، شرک کے منظروں سے عاجز و پریشان، بے ساختہ پکار اُٹھی۔

یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا اے میرے قوم والو! تم جو کچھ اور جس کسی کو بھی،

ہے؟ (قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ)
بعضے بعضے بول اُٹھے۔ کہ ہو نہ ہو حرکت اسی نوجوان ابراہیم نامے کی ہے
سنا نہ تھا اس کو ہم نے، وہی تو ہمارے ٹھاکروں کی شان میں بے ادبی کے
کلمہ بک رہا تھا (قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ)
تلاش ہوئی اور آپ مجمع کے سامنے پکڑے آئے (قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى
اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ) پوچھ پاچھ آپ سے شروع
ہوئی (قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ) آپ
تو اس موقع کی تاک ہی میں تھے۔ اُس بڑے بُت کی طرف اشارہ کرکے بولے
کہ جی اور کیا کہیں یہ حرکت ان بڑے صاحب کی تو نہیں۔ اِن سے پوچھ
دیکھئے۔ نا۔ بیان تو یہ بہرحال دے ہی سکتے ہوں گے! —— انداز بیان
تمام تر طنزیہ۔ ایسے موقع کے لئے مناسب حال بھی، موثر بھی۔
مجمع ظاہر ہے۔ کہ اس واقعہ سے مشتعل بھی ہوا ہوگا اور منفعل بھی! ایسے
ایسے درس توحید کے ابراہیمؑ کے ہاں روز ہی ہوا کرتے تھے۔ قرآن مجید کے
واسطہ سے ان تبلیغی تقریروں اور خطبوں کے ٹکڑے محفوظ رہ گئے ہیں کبھی
آپ فرماتے۔ کہ تمہاری عقلیں کیسی ماری گئی ہیں۔ اللہ کو چھوڑ چھوڑ تم کس کی
پوجا میں لگے رہتے ہو؟ وہ جو نہ ذرہ بھر تمہیں نفع پہنچا سکے۔ نہ نقصان
یہ تف ہے تمہارے اوپر اور تمہارے بے بس معبودوں پر! (اُفٍّ لَّكُمْ

کہ تم تو نہ ڈرو میرے طاقت و قوت والے ہمہ تواں خدا سے، اور میں ڈر جاؤں تمہارے بے طاقت، ناتواں، خود ساختہ معبودوں سے!

قوم کی مخالفت اب زوروں پر ہے۔ اور ابن آزر کی دعوتِ توحید وردِ شرک اب کوئی صیغۂ راز میں نہیں۔

ایک روز آپ کے دل میں آیا۔ کہ ان بے وقوفوں کو سبق علانیہ دیجئے اور ان کی مشرکانہ حماقت کو آشکار اُن پر برملا کیجئے دِن اُن کے میلہ کا آپڑا میلے ٹھیلے تو مشرک قوموں کی زندگی کے جزو لاینفک ہیں۔ وہ میلہ تھا کہیں شہر سے باہر چھوٹے بڑے سب کھنچے چلے جا رہے تھے، آپ نے ہانک پکار کر کہہ دیا، اور کسی کسی نے آپ کی آواز سُن بھی لی۔ کہ "اچھا۔ جا تو رہے ہو لیکن خدا کی قسم میں بھی تمہارے پیچھے تمہارے بتوں کی گت بنا کر رکھ دونگا تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ۔

اِدھر وہ گئے، اُدھر میدان خالی پا آپ ان کے دیوہرے میں گھُس گئے۔ اور ایک ہتھوڑی لے سب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ بجز بڑی مورتی کے کہ آخر تو تحقیق ہوگی ہی۔ اس وقت خوب موقع قایل کرنے کا ملے گا فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ)

میلہ واپس ہوا۔ اور پجاریوں نے آکر اپنے معبودوں کی یہ گت بنی ہوئی دیکھی، ہلچل پڑ گئی۔ لگے آپس میں کہنے۔ کہ یہ کِس بے ادب، نالایق کی حرکت

پہنچے، طلبی پر، یا بلا طلب، قرآن اپنے حکیمانہ انداز بیان کے مطابق یہ درمیانی غیر ضروری کڑیاں حذف کرتا جاتا ہے، اور بادشاہ سے دو بدو گفتگو شروع ہوئی۔ بادشاہ نے پوچھا۔ وہ کون ہے۔ آپ کا عجیب و غریب، اَن دیکھا پروردگار اور معبود؟ ذرا اس کے اوصاف تو سنوں؟ آپ نے فرمایا۔ "ارے اس کے وصف تو آفتاب سے بڑھ کر روشن ہیں۔ سارے نظامِ کائنات کا وہی تو مالک و مختار ہے۔ موت و زندگی کا سارا کارخانہ اُسی کے دستِ قدرت میں تو ہے۔ وہی جس کو چاہے جلائے۔ وہی جس کو چاہے مارے۔

مشرک بادشاہ کا دماغ ہی کتنا بے مغز آپ کے استدلال کے مغز تک نہ پہنچا۔ صرف ظاہری اور سطحی پہلو کو لے کر بولا "یہ کونسی بڑی بات ہے۔ یہ تو میری قدرت کے تحت میں ہے۔ روز کیا ہی کرتا ہوں (قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ) جس کی چاہوں جان لے لوں جس کو چاہوں جان بخش دوں۔ قرآن مجید میں بس اتنا ہی ہے روایات تفسیری میں اتنا اور آتا ہے کہ قول اور عمل میں مطابقت پیدا کرنے کو اسی وقت اس نے ایک خونی مجرم کی جان بخشی کر دی، اور ایک بے گناہ کو قتل بھی کرا دیا۔ بہر صورت جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ مخاطب اتنا نافہم ہے۔ تو آپ نظامِ عالم سے جو استدلال کر رہے تھے۔ اس کو آپ نے ایک آسان تر مثال پیش کیا آپ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُکُمْ شَیْئًا وَّلَا یَضُرُّکُمْ اُفٍّ لَّکُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ) اور کبھی جب دیکھتے۔ کہ مخاطبین نے اچھا خاصہ ہجوم کرلیا ہے۔ تو فرماتے، کہ اللہ تمہارا خالق تمہاری ذات کا، صفات کا، افعال کا خالق، پھر کیا ہوا ہے تمہاری عقلوں کو۔ کہ جن مورتیوں کو اپنے ہاتھوں گڑھتے ہو۔ تراشتے ہو، انہیں کی لگ جاتے ہو پوجا کرنے! (فَاَقْبَلُوْٓا اِلَیْهِ یَزِفُّوْنَ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ)

حضرت ابراہیمؑ کی نبوّت کے، فضیلت کے، تقدّس کے قایل جس طرح مسلمان ہیں۔ اسی طرح یہود اور مسیحی بھی ہیں لیکن آپ کی زندگی کے دور عراقی میں آپ کی اس توحید پرستی اور آپ کی تذکیر و تبلیغ کے تذکرے صرف قرآن مجید ہی کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ باقی بائبل والوں کے ہاں تو گویا یہ موضوع کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا!

بادشاہ کو لگا۔ کہ ایک شخص اس عجیب و غریب عقیدۂ توحید کی تبلیغ اور سرکاری مذہب سے بغاوت کر رہا ہے۔ رعایا تو خیر مشرک ہی تھی، بادشاہ سلامت چشم بد دور مرکزِ شرک! یعنی خود ہی سب سے بڑے دیوتا کے اوتار! رعایا سے اطاعت ہی کے نہیں۔ پرستش کے بھی طلبگار!——مشرک قوموں کے ہاں یہ دستور انوکھا نہیں۔ عام ہے —— آپ دربار میں

آگ تک پہنچے۔ تو لپکتے ہوئے شعلے آپ کے حق میں سبزہ وگلزار تھے (قُلْنَا یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ) آگ نام کسی فاعلِ مختار کا نہیں۔ وہ بھی آخر کسی کے حکم ہی کے تابع ہے۔ اور جس کی تابع ہے اُسی کا یہ حکم پہنچ چکا تھا۔ کہ خبردار! کوئی گزند ابراہیمؑ کو نہ پہنچنے پائے۔ سوزِ عشق میں ڈوبے ہوئے، آتشِ توحید میں تپے ہوئے آپ پہلے ہی سے تھے۔ اِس مادّی آگ کی بھٹّی میں پڑکر اور نکھر گئے ——— امتحان وفا اتنا بڑا، اتنا کڑا، اور کِس نے دیا؟ خُلّت کے امتحان میں اس سے اچھے نمبروں میں اور کون پاس ہوا؟ خلیل اللہ کا لقب آپ کو نہ ملتا۔ تو اور کِس کو ملتا؟

حکمتِ الٰہی میں اب وقت آگیا تھا۔ کہ آپ وطن سے بے وطن ہوں اور اپنے ملک سے ہجرت کریں۔ اتنی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کے بعد آپ ملک میں رہ سکتے کیونکر تھے؟ چلے ہیں۔ تو ساتھ میں آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت سارہؑ تھیں۔ اور آپ کے بھتیجے حضرت لوطؑ۔ اتنی کوششوں اور کاوشوں کا حاصل کُل یہی دو تو تھے ہی۔ انہیں دو نے تو آپ کو سچا جانا تھا۔ شرک کو چھوڑ کر توحید کو مانا تھا۔ ہاں خادموں اور غلاموں کی پوری جماعت اگر ہمرکاب ہو تو کچھ عجب نہیں آخر آپ شیخ القبیلہ بھی تو تھے۔ اور توریت میں تصریح ہے۔ کہ جانوروں، مویشیوں کے بہت سے گلّے آپ کے ساتھ تھے ہر حال منزل در منزل سفر کرتے، راہ میں توحید کا درس دیتے اپنے مالک کی

نے فرمایا۔ کہ اچھا خیر۔ یہ تو بتایئے۔ کہ یہ آفتاب جو میرے اور اپنے سب کے پروردگار کے ہمہ گیر قانون کے مطابق روز سمتِ مشرق ہی سے طلوع ہوتا رہا ہے۔ آپ کے بس میں ہے۔ کہ اس کی رفتار کو گھما دیں، اور آفتاب بجائے مشرق کے مغرب سے نکل آئے؟ (قَالَ اِبْرَاهِیْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ) یہ مثال اتنی عام فہم تھی۔ کہ اس کے بھی سمجھ میں آگئی۔ جواب دے ہی کیا سکتا تھا؟ لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا قرآن کی بے نظیر منظر نگاری میں فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ،

ان چند متفرق منظروں سے واضح ہو جاتا ہے۔ کہ آپ کی عراقی زندگی وقف تھی توحید کی تبلیغ کے لئے۔ تبلیغ گھر والوں پر بھی، باہر والوں پر بھی،

عوام کو بھی، خواص کو بھی، سربازار بھی، سردربار بھی لیکن یہ دھیمی دھیمی انچ کب تک جلتی۔ مخالفت کے شعلے بھڑکے، اور عداوت کے شرارے بلند ہوئے۔ حکومت کے مذہب (State Religion) کی تحقیر، جمہور کے عقاید کی تردید کوئی معمولی بات ہوتی ہے؟ حکم ہوا کہ یہ ہمارے خداؤں کا دشمن، ہمارے دیوتاؤں کا باغی یوں نہ مانے گا۔ ایک بڑا آتشکدہ تیار کر کرا کر اس میں اسے جھونک دو۔ جل بھن کر خاکستر ہو جائے۔ اس دور تمدن میں ایسی سزائیں شاذ نہیں۔ عام تھیں۔

تیاریاں ہوئیں۔ سامان ہوئے۔ آپ آگ میں پھینکے گئے لیکن جب

حضرت ابراہیمؑ مصر سے عرب آگئے تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ کے مولد میں اختلاف ہے۔ مولد فلسطین ہو یا عرب۔ بہرحال اس قدر مسلّم ہے۔ کہ جب حضرت اسمٰعیلؑ قریب بلوغ کے پہنچ لئے۔ اور حضرت ابراہیمؑ کا سن ۹۹ سال کا ہو چکا۔ تو اب خیال بڑی بیوی حضرت سارہؓ کو بھی اولاد کا ہوا فرشتوں نے آکر بشارت دی۔ کہ اولاد ہو گی۔ چنانچہ حضرت اسحٰقؑ کی ولادت ہوئی۔ ان کا سال ولادت سنہ ۲۰۶۰ ق۔م ہے۔ اب تک حضرت سارہؓ اور حضرت ہاجرہؓ میں خوب بن رہی تھی۔ اور حضرت سارہؓ اپنا لڑکا حضرت اسمٰعیل ہی کو سمجھ رہی تھیں لیکن اب دونوں صاحب اولاد تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ اب آئندہ نباہ کے لئے یہی بہتر سمجھے کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو حضرت سارہ سے دُور ملک عرب میں لاکر رکھیں۔ چنانچہ آپ نے یہی کیا۔ اور اپنی بھی آمد و رفت برابر عرب میں جاری رکھی۔

زندگی کے عراقی دَور اور فلسطینی دَور کے بعد عربی دَور آپ کی زندگی کا گزر رہا تھا۔ کہ آپ کو عالم رویا میں حکم ملا۔ کہ اپنے اکلوتے فرزند کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں۔ یہ "اکلوتے بیٹے" کا لفظ قرآن کا نہیں۔ خود توریت کا ہے۔ پیمبروں کے خواب بے معنی نہیں بامعنیٰ ہوتے ہیں۔ قلب اتنا صاف ہو چکا ہوتا ہے، کہ حواس ظاہری اور شعور کے تعطّل کی حالت میں بھی جو نقش اس لوح پر آکر جمتا ہے، وہ باطل نہیں، صحیح ہی ہوتا ہے۔ صبح اُٹھ، باپ نے

بڑائی پکارتے، آپ ملک شام میں پہنچے۔ اور پھر اُس کے مغربی علاقہ میں آئے جو اب فلسطین کہلاتا ہے۔ توریت میں ہے۔ کہ اس سفر کے وقت آپ کی عمر ۷۵ سال کی تھی۔ اور آپ کا سالِ ولادت اوپر گزر چکا ہے۔ کہ سنہ ۲۱۶۰ ق م تھا۔ اس حساب سے آپ فلسطین میں سنہ ۲۰۸۵ ق۔م میں وارد ہوئے۔ جب وہاں قحط پڑا۔ تو آپ مصر چلے آئے۔ یہاں کا بادشاہ آپ کا ہم نسب نکلا۔ تجربہ کے بعد آپ کی ذاتی بزرگی کا بھی قایل ہو گیا۔ رخصت کے وقت علاوہ اور بیش قیمت تحفہ تحایف کے اس نے اپنی لڑکی کو بھی خدمت میں پیش کر دیا اُس زمانہ کے دستور کے مطابق یہ کہہ کر کہ "یہ کنیز آپ کی اور بڑی بیوی صاحبہ کی خدمت کے لئے حاضر ہے"۔ یہی شہزادی ہاجرہؑ آپ کی دوسری بیوی تھیں، اور انہیں کو ناخدا ترس یہود نے آگے چل کر باندی یا لونڈی مشہور کر دیا۔ حضرت ہاجرہ کے فضایل، اور وہ فضایل جو یہود کو مسلّم ہیں ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ان کا ذکر حضرت اسمٰعیل کے ذیل میں کبھی سنئے گا۔

حضرت کا سن اب ۸۵۔۸۶ سال کا ہو چکا تھا۔ اس وقت کے اوسط عمر کے لحاظ سے یہ سن بڑھاپے کا نہ تھا۔ تاہم جوانی تو گزر ہی چکی تھی۔ تمنا آپ کو قدرتاً پیدا ہوئی کہ اپنا جانشین صالح چھوڑ جائیں دعا کی۔ قبول ہوئی (ربّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ۔ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ) سنہ ۲۰۷۴ ق۔م میں انہی حرم ثانی سے صاحبزادہ ہوئے۔ اور وہ اسمٰعیل کہلائے۔

گیارہویں اور بارہویں کو، یہ سب یادگار ہیں اُسی " ذبح عظیم " کی!

یہی ذبیح اللہ جب ذرا اور بڑے ہوئے۔ تو باپ اور بیٹے دونوں نے مِل کر دنیا کے شرکستان میں خدائے واحد کی عبادت کا گھر تعمیر کیا۔ باپ کی نگاہِ کشفی نے دیکھ لیا۔ کہ تجلیاتِ جمالی و کمالی کا مرکز، بیت المعمور کے مقابل روئے زمین پر عرب کے ملک میں حجاز کے علاقہ میں وادیٔ مکہ " ہے۔ بیٹے کو ساتھ لے۔ بغیر انجنیروں اور معماروں اور مہندسوں کی مدد کے، ایک مربع نما مستطیل عمارت کھڑی کر دی۔ وہی عمارت کعبہ کہلاتی ہے۔ آج تک ہر ابراہیمی کا قبلہ، ہر توحید والے کا قبلہ، عمارت کیا۔ بس ایک عظیم الشان کمرہ ہے۔ کوئی ۷۵ فٹ لمبا، ۶۰ فٹ چوڑا، اور ۸۰ ـ ۸۱ فٹ اونچا۔ اسمٰعیلؑ کی عمر اسوقت اگر ۲۰ سال کی فرض کی جائے۔ تو اس بنائے ابراہیمی کی تاریخ کوئی سنہ ۲۰۵۴ ق۔م قرار پاتی ہے۔ یعنی آج سے کوئی چار ہزار سال قبل۔ یہ محض تخمینہ ہے باقی نفسِ قدامت اس بیت العتیق ؟ کے مخالفین یہود و نصاریٰ تک کو تسلیم ہے۔

مزدوروں[۱] کو اکثر دیکھا ہوگا۔ جب کام کرتے جاتے ہیں۔ تو کچھ گنگناتے

---

[۱] یہاں سے لے کر تین پیروں تک کا بیشتر حصہ ماخوذ ہے۔ راقم سطور کے سفر حجاز صفحہ ۲۴۱ و صفحہ ۲۴۲ سے (مطبع دار المصنفین، اعظم گڑھ)

بیٹے سے خواب بیان کیا۔ اور بولے :"خواب سن چکے، جان پدر! اب اپنی رائے بتاؤ" ___ دنیا کی تاریخ میں کیوں کسی باپ نے اپنے بیٹے اور اکلوتے لاڈلے بیٹے سے خود اسی کے قتل کے باب میں مشورہ کیا ہوگا؟ ___ ابراہیمؑ جیسے شفیق ورحمدل اور رقیق القلب باپ نے نہ سہی کسی شقی القلب اور بیدرد باپ نے بھی کیا ہوگا؟ لیکن بیٹا بھی کس باپ کا تھا، اور کس نامور ترین انسان کا مورثِ اعلیٰ بننے والا تھا۔ جواب دیا۔ بے جھجک اور بے دھڑک۔ کہ" ابا جان! حکمِ خداوندی کے بعد صلاح ومشورہ کیسا؟ کر گزر رئیے بے تامل جو کچھ آپ کو حکم ملا ہے رہا میں تو اپنے اور آپ کے رب ہی کے بھروسہ پر کہتا ہوں۔ کہ ثابت قدم رہوں گا۔" اب کیا تھا (قَالَ یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ) بیابان میں باپ نے بلوغ پر پہنچنے والے اکلوتے بیٹے کو ذبح کے جانوروں کی طرح ہاتھ پاؤں باندھ کر لٹا یا۔ چھری تیز کی۔ اور روایتوں میں آتا ہے۔ کہ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھری بیٹے کے حلقوم پر چلائی۔ کہ وحیِ الٰہی کی آواز آئی۔ کہ" ہو چکی آزمایش۔ ابراہیم ہو چکی۔ تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ لو یہ مینڈھا اس کے بجائے ذبح کرو۔ تمھاری قربانی قبول ہوئی اور تمھاری یادگار سلام و رحمت کے ساتھ ہم نے آئندہ نسلوں میں چلا دی۔

___ چنانچہ آج مسلمان جو بے شمار جانوروں کی قربانیاں کرتے رہتے ہیں روئے زمین کے گوشہ گوشہ میں اور اسلام کے عین مرکز میں ذی الحجہ کی دسویں اور

اپنی کوئی بھی نماز بغیر اس مقدّس مزدور پر درود و سلام بھیجے۔ نہ تمام کرتے ہیں رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا دے، اپنا کر لے، اور ہماری اولاد سے۔ ایک امّت پیدا کر اپنی فرمانبردار اپنی مسلم، ہمیں ہمارے حج کے اعمال بتا اور ہم پر رحمت سے توجّہ فرما۔ بیشک تو ہی تو ہے بڑا توبہ قبول کرنے والا۔ (ماضی میں) اور بڑا مہربان (مستقبل میں) ابراہیمؑ کی دعا کہیں خالی جا سکتی تھی؟ مزدور کو تو جو مزدوری ملی۔ اُس کا حال وہ خود جانے، یا اس کا دینے والا، البتہ اس گھر کا طواف کرنے والوں کو۔ اس کی طرف منہ کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونیوالوں کو، اس کی محبّت و عظمت کو دل میں جگہ دینے والوں کو کیا کچھ نہیں مل سکتا کیا کچھ نہیں مل جاتا؟ کیا کچھ نہیں مل چکا ہے۔

گھر کی عزّت اور عظمت کو، برکت و رحمت کو۔ سب ہی دیکھتے ہیں۔ دوست ملنتے ہیں۔ دشمن صرف جلنتے ہیں۔ کم لوگ یہ ذہن میں رکھتے ہیں کہ بنانے والے کا خمیر کس اخلاص و فنائیت کی مٹی سے ہوا تھا۔

روم کا مشہور و معروف عارف کہتا ہے ؎

کعبہ را اکش ہر دمے عزّت فزود　　　آں ز اخلاصات ابراہیم بود

بھی جاتے ہیں۔ اللہ کے گھر کے مزدور جس وقت اللہ کے گھر کی بنیادیں بھر رہے تھے۔ دیواریں کھڑی کر رہے تھے تو یہ بھی اپنی زبانوں پر مہر کئے ہوئے نہ تھے۔ جس کا گھر بنا رہے تھے۔ اسی سے کچھ مانگتے بھی جاتے تھے۔ ہاتھ مشغول تعمیر میں بیت کے، اور دل یاد میں ربّ البیت کے۔ دل میں جس کی یاد زبان پر اس کا نام۔ بے آب وگیاہ سرزمین کی چلچلاتی دھوپ میں، دنیا کی کسی طمع کے بغیر۔ پتھر پر پتھر جوڑتے جاتے تھے۔ اور دل کے سوز و گداز کے ساتھ تو یقیناً۔ اور آنکھوں کی تراوٹ کے ساتھ غالباً زبانیں اسی ذکر میں مشغول تھیں رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ اے ہمارے رب، ہم سے قبول فرما! ہماری یہ خدمت قبول فرما! بے شک تو ہی تو ہے سننے والا (منہ سے نکلے ہوئے بولوں کا) اور جاننے والا (دلوں کی نیتوں کا) اللہ اللہ! یہ شان فنا ہوتی ہے۔ اللہ پر قربان ہونیوالوں کی۔ اللہ کے خلیل کہلانے والوں کی! اپنے کو مٹا چکے ہیں۔ مٹا رہے ہیں، پھر بھی دھڑکا یہی لگا ہوا۔ کہ دیکھئے یہ اپنے کو مٹانا بھی قبول ہوتا ہے یا نہیں!

دنیا کے کِس مزدور نے وہ مزدوری مانگی جو بیت اللہ کے اِس بڑے مزدور نے مانگی؟ کِس نے وہ مزدوری پائی جو بیت اللہ کے اِس بڑے مزدور کے حصہ میں آئی؟ مزدوری کی طلب، مزدوروں کو تنہا اپنے لئے نہ تھی۔ ہمارے لئے تھی۔ آپ کے لئے تھی۔ اُن سب کے لئے تھی۔ جو

موقعوں پر آیا ہے۔ کہ سب کو سمیٹنا اِس مختصر صحبت میں ممکن نہیں احادیث اور تفسیری روایات کا جو ذخیرہ ہے۔ وہ اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک جگہ آیا ہے کہ ہم نے امتحان لیا ابراہیمؑ کا چند باتوں میں وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ وہ باتیں کون سی تھیں۔ اور اِمتحان کی نوعیت کیا تھی، یہ تفصیلات نہ درج ہیں۔ نہ اُن کے معلوم ہونے کی ضرورت۔ سب اِمتحانات میں پُورے اُترے فَاَتَمَّھُنَّ اِنعام یہ ملا۔ کہ عالم اِنسانیت کی امامت اُن کے سپرد کر دی گئی۔ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا امامت بھی۔ اللہ اللہ کیسی امامت! سال سینکڑوں نہیں ہزاروں گذر چکے۔ بابل و نینوا کا نام و نشان تک مِٹ چکا اور اہل توحید ہیں۔ کہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہوں، نماز کی نیت جب باندھیں گے۔ منہ کریں گے ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے کعبہ کی طرف سالانہ قربانی جہاں کہیں پیش کریں گے حوالہ زبان پر ابراہیم کے نام کا لائیں گے (کما تقبلت مِن خلیلك ابراھیم، حج کرنے جائیں تو سجدہ کریں گے مقامِ ابراہیمؑ پر، نماز کے آخر میں سلام و رحمت بھیجنے بیٹھتے ہیں، تو نام اپنے رسول سے بھی پہلے لیتے ہیں۔ اُن کے اِنہیں جدِّ کرمؑ کا اور اکیلے اہلِ توحید ہی نہیں۔ یہود بھی اپنی بگڑی ہوئی توحید، اور مسیحی بھی اپنی برائے نام توحید کو لئے ہوئے کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ دَم بھر رہے ہیں، اللہ کے اسی برگزیدہ بندہ کا! —— کوئی حد ہے اِنعام کی؟ اور کیوں ہو؟ جب بندہ کی طرف سے کمی نہ ہو اخلاصات میں تو مولےٰ کی طرف سے کوئی کسر کیوں اُٹھ رہے اِنعامات میں!

حد یہ ہے کہ قرآن میں یہ آگیا ہے۔ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا

فضلِ آں مسجد زخاک و سنگ نیست   لیک در نباشد حرص و جنگ نیست

اور بالکل سچ کہتا ہے۔ کہ کعبہ کی عزتوں اور فضیلتوں میں تم ہر لحظہ جو ترقی و برتری دیکھتے ہو۔ یہ ابراہیمؑ ہی کے اخلاص و صدق نیت کا ثمرہ ہے۔ وہی پتھر اور وہی مٹی۔ آخر ہر مسجد بلکہ ہر عمارت میں تو لگے ہوئے ہیں! ان کے علاوہ اس میں کوئی اور نئی چیز نہیں۔ نئی چیز یہی ہے کہ اس کا بنانے والا نہ کوئی انجنیر تھا۔ نہ کوئی مہندس۔ نہ کوئی بادشاہ نہ امیر، وہ تھا جو خودی کو مٹا چکا تھا۔ اپنے کو خدا کا بنا چکا تھا۔

تصوّف کی ان لطافتوں سے اور ملاحتوں سے پھر آجائیے، تاریخ کی ٹھوس خارجیت کی طرف، جامد واقعیت کی طرف، حضرت سارہؑ کی عمر جب ایک سو ستائیس سال کی ہوئی۔ تو حسب روایت توریت انہوں نے انتقال فرمایا۔ اور حبرون (Hebron) میں مدفون ہوئیں۔

اب اسی کو خلیل الرحمٰن یا صرف الخلیل کہتے ہیں۔ بیت المقدس سے کوئی ۲۰ میل کے فاصلہ پر جنوب و مغرب میں ایک چھوٹا سا شہر کوئی ۱۸ ہزار کی آبادی کا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ نے ایک اور شادی بی بی قطورہ کے ساتھ کی۔ ان سے چھ اولادیں ہوئیں اور ان کی نسل سے ۲۱ قبیلہ چلے۔ قرآن نے جنہیں اصحابِ مدین کہا ہے۔ وہ یہی لوگ تھے۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر جمیل اس کثرت سے اور اتنے

اللہ نے ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنالیا؛ خلیل، کا ترجمہ دوست سے کرنا غلط کے مرتبہ کو بہت ہلکا کر دینا ہے۔ توریت میں بھی ایک نہیں دو مقامات پر لیکن دونوں جگہ ضمناً، ابراہیم کو خدا کا دوست کہا ہے (یسعیاہ ۴۱:۸ اور ۲ تواریخ ۲۰:۷) اور اسی پر انجیل والوں کا بھی ایمان ہے ــــــ خالق اپنے مخلوق کو قادر علی الاطلاق اپنے بندۂ محدود کو اپنا خلیل کہہ کر پکارے! سرفرازیوں اور عزت افزائیوں کی بس انتہا ہے! خود قرآن ہی میں نہ آگیا ہوتا تو کوئی بندہ تو اپنی طرف سے ایسا لقب تراشنے کی جرات بھی نہ کرسکتا! فیاضی، مہمان نوازی، نرم دلی، شفقت خلق کی روایتوں اور حکایتوں سے یہودی اور اسلامی لٹریچر دونوں لبریز ہیں۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے قصہ کے ضمن میں تصریح ہے۔ کہ فرشتے انسانی لباس میں آپ کے پاس آئے۔ آپ کے لئے وہ اجنبی محض تھے۔ لیکن فوراً ہی آپ ان کے سامانِ ضیافت میں لگ گئے۔

۱۹۸۵ء ق۔م میں بیٹوں اور پوتوں کی موجودگی میں سکینت اور اطمینان کیساتھ ۱۷۵ سال کی عمر میں جان، جان آفریں کے سپرد کی اور ابالخلیل کے بیرون حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف وغیرہم کیساتھ زیر خاک آسودہ ہیں۔ یہ تربتیں ایک خانہ کے اندر ہیں۔ اور غار کا دروازہ بند ہے! ایک روایت مشہور یہ ہے۔ کہ ترکوں کے عہد حکومت میں ایک ترک والی شام نے فرطِ عقیدت سے اندر اُترنا چاہا۔ جانے کو تو چلا گیا لیکن باہر آیا تو اپنے حواس میں نہ تھا۔ کسی نے مجذوب قرار دیا۔ اور کسی نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے۔ عالم برزخ کا کچھ حصہ شاہدہ میں آگیا۔

تمت